بہادری کے کارنامے

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے
ابتدائی دور کے چند کردار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

بہادری کے کارنامے

بہادری کے کارنامے

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے
ابتدائی دور کے چند کردار

منوج داس

مترجم

ایس . ایم . احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک-1، آر . کے . پورم، نئی دہلی110066

Bahaduri ke Karnamey
By : Manoj Das

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت	:	جنوری۔مارچ 2003 شک 1924
پہلا اڈیشن	:	1100
قیمت	:	25/=
سلسلۂ مطبوعات	:	1066

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

حکومتِ ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، ملک بھر کے بچوں کو ان کی مادری زبانوں کے ذریعے تعلیم دیے جانے کا ایک مکمل اور جامع طریق کار وضع کر کے اس پر عمل پیرا ہے۔ اس منصوبے کے تحت اردو زبان میں بھی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجوں کے لیے نصابی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں این. سی. ای. آر. ٹی. کی تیار کردہ ہیں۔ اردو میں ان کے ترجمے کا کام قومی اردو کونسل کی وساطت سے ہوا ہے۔

این. سی. ای. آر. ٹی. نے اسکول کی سطح کی سو سے زیادہ معاون درسی کتابیں بھی انگریزی اور ہندی میں چھاپی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ اردو طلبہ کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے منتخب کتابوں کے اردو تراجم شائع کیے جائیں۔ پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے مددگار ثابت ہوگی اور اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

نئی دہلی

پیش لفظ

اسکول کی سطح پر جاری تعلیم میں ہمہ جہت بہتری لانے کے مقصد سے جہاں ایک طرف این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ بچوں میں تعلیمی مقابلہ آرائی کے فروغ کے لیے کوشاں ہے وہیں دوسری طرف ان کی سماجی اور اخلاقی ترقی میں بھی مدد کرنا چاہتی ہے۔

اگر ابتدائی سطح پر جبکہ بچوں کا ذہن جلد اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے، صحیح رجحانات کی پرورش نہ ہوتی تو پھر آگے چل کر ان کو صحیح سمت میں موڑنا بہت مشکل ہو جاتا اسی وجہ سے تمام تعلیمی کمیٹیاں اور کمیشن اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ اسکولی سطح پر ہی بچوں کو اخلاقی یا اقداری تعلیم دی جائے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں کہا گیا ہے کہ:

"سماج میں بنیادی اقدار کی تباہی اور پاگل پن کے تیئں بڑھتی ہوئی فکرمندی نے لوگوں کی توجہ اس نقطہ پر مرکوز کر دی ہے کہ نصاب کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ تاکہ تعلیم کو سماجی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کو فروغ دینے کا اہم وسیلہ بنایا جا سکے"۔

جہاں تمام دنیا میں اعلیٰ اقدار سے متعلق تعلیم کی ضرورت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ وہیں بہت سے ممالک میں ابھی بھی یہ موضوع زیر بحث ہے کہ بچوں کو صحیح اقدار ذہن نشین کرانے کا سب سے بہتر طریقہ کون سا ہے۔ یہ تحقیق کے لیے ایک نیا میدان ہے، قدرتی طور پر ہماری ابتدائی کوشش عارضی اہمیت کی حاصل ہو گئی ہے اسی مقصد کے پیش نظر این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نے اقدار تعلیم کے عنوان سے پروجیکٹ شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اسی ضمن میں پہلے قدم کے طور پر اساتذہ اور طلبا کے لیے ایسا مواد مرتب کرنا چاہتے ہیں جو ان کے احساس کو بیدار کرنے اور اقدار ذہن نشین کرانے میں معاون ثابت ہو۔

موجودہ کتاب "بہادری کے کارنامے" مشہور مصنف جناب منوج داس صاحب نے لکھی ہے۔

انہوں نے بچوں کے سامنے ایسے لوگوں کی زندگی کی حقیقی کہانیاں پیش کی ہیں جن کے دل ودماغ میں غیر معمولی ہمت، جرأت اور پختگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان لوگوں کی کہ جنہوں نے اپنے عملی نمونہ سے یہ ثابت کر دیا کہ ہر مرد و عورت میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ مخالف ترین حالات میں بھی نہ دبنے والے جذبے سے کام لے کر وہ کس طرح ملک اور وطن کی حفاظت، آزادی اور خوش حالی پر اثر انداز ہونے والے طوفانی حالات کا رخ موڑ سکتے ہیں؟ یہ کہانیاں مکمل طور پر وطن پرستی، سیکولرزم، اتحاد اور بے خوفی کا انمٹ نمونہ ہیں۔ اور یہ واقعات قاری کے ذہن پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔

جناب منوج داس ایک منفرد داستان گو ہیں اور ہمیں قوی امید ہے کہ ان کہانیوں سے نہ صرف یہ کہ بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ ہمارے ملک کے بچے ان سے فیضیاب حاصل کریں گے۔ میں جناب منوج داس صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری گذارش پر ہندوستانی بچوں کے لیے اتنی خوبصورت کتاب تحریر کی۔

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ کے ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان سوشل سائنس اینڈ ہیومنیٹیز کے پروفیسر اور ہیڈ ڈاکٹر اَرِل ودیالنکر اس پروگرام یعنی "اقدار کی تعلیم" کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اسی پروگرام کے تحت یہ موجودہ کتاب حاضر خدمت ہے۔ اسی ڈپارٹمنٹ کی پروفیسر (کماری) ایس۔ کے۔ رام نے اس کتاب کے مسودہ کو آخری شکل دینے اور ان کہانیوں کی ایڈیٹنگ میں بڑی مدد کی ہے۔ اس گرانقدر خدمت انجام دینے پر میں ان دونوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو اساتذہ، طلبا اور والدین بھی اس کتاب مطالعہ کریں ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے خیالات اور مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں۔

پی۔ ایل۔ ملہوترا
ڈائریکٹر
این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی

نئی دہلی
اگست 1986

دیباچہ

میری اس کاوش کو کسی طرح بھی ہندوستانی جنگ آزادی کی تاریخ وار تصویر پیش کرنے کی جرأت نہ سمجھا جائے تاہم یہ چند ایسے کرداروں سے متعلقہ داستان کا ایک چھوٹا سا گلدستہ ضرور ہے جنہوں نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور حیران کن جرأت وہمت کا مظاہرہ کیا۔

منتخب کہانیاں انگریز مصنفین کے بیان کردہ تاریخی مواد پر مبنی ہیں۔

ان واقعات سے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف لڑی جانے والی ابتدائی تحریکوں میں نمایاں پہلو سامنے آتے ہیں۔ پہلے دو کہانیوں کے واقعات کا تعلق (ہندوستان کی) پہلی جنگ آزادی سے رونما ہونے سے پہلے کے دور سے ہے۔ جبکہ بعد کی چھ کہانیاں اسی دور پر مبنی ہیں۔

آخری واقعہ کا تعلق اس صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں رونما ہوئے انقلابی جذبہ سے ہے۔

منوج داس

سری آروبندو انٹرنیشنل
سینٹر آف ایجوکیشن، پانڈیچیری

بہادری کے کارنامے

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے
ابتدائی دور کے چند کردار

ترتیب

1

جنگل کا آخری تیر انداز

1857 کی عظیم بغاوت سے دو برس پہلے کی بات ہے کہ برطانوی سامراج کو ایک ایسے علاقہ کے لوگوں نے للکارا جہاں سے اس بات کی کوئی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ انہوں نے یکایک اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ صرف خدا ہی ان لوگوں کا بادشاہ ہے برطانوی یا ایسٹ انڈیا کمپنی ہرگز نہیں ہوسکتے۔

سوال یہ تھا کہ یہ آزادی کیسے حاصل کی جائے ؟ کیا کلکتہ تک پیدل مارچ کر کے برطانویوں کو نکال کر! اور یہ کہ انہیں کیسے نکالا جائے ؟ کیا انہیں تیروں سے چھید دیا جائے ؟ زہریلے تیروں سے۔ کچھ کا خیال تھا۔ نہیں یہ تو دھوکا دینا کہلائے گا آخر یہی طے پایا کہ وہ کوئی گری ہوئی حرکت نہیں کریں گے۔ وہ جنگ کریں گے مگر یہ لڑائی بہادری سے اور شان سے لڑی جائے گی۔

اس اچانک تحریک سے سرکاری اہلکار بھونچکا رہ گئے۔ حیرت کی بات تھی کہ جنگلوں میں رہنے والے اس خاموش طبقہ نے آواز کیوں کر اٹھائی جو درختوں کی طرح صابر اور پرسکون طبیعت کے مالک تھے۔ چاہے ان پر جتنا بھی ظلم کیا جاتا یہ خاموش ہی رہا کرتے تھے ؟ آپ کسی درخت کو کاٹیں، یہ کبھی اُف تک نہیں کرتا۔ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ گر جاتا ہے۔ یہی حال ان سنتھالیوں کا بھی تھا۔ یہ سارے ظلم برداشت کرتے تھے۔ 1838 میں وہ اپنی زمین کا لگان حکومت کو دو ہزار روپے سالانہ ادا کیا کرتے تھے۔ چند برسوں بعد حکومت نے لگان بڑھا کر 44 ہزار

کر دیا۔ انہوں نے اف تک بھی نہ کی؟ اور خاموشی سے یہ لگان ادا کرتے رہے۔ زمیندار ان سے سو روپے کا سود پانچ سو روپے وصول کرتے اور جب تک وہ یہ رقم ادا نہ کر دیتے انہیں اس کے کھیتوں پر غلاموں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔ عام طور پر اس کا سلسلہ دو یا تین نسلوں تک جاری رہتا۔ مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کر لیا کرتے تھے۔ اچانک ان میں اس قدر تبدیلی کیسے رونما ہو گئی؟ یہ لوگ تو شیروں اور مگرمچھوں کے ساتھ بھی بسر کر لیتے تھے۔ کیا یہ برطانویوں اور ان کے پٹھوؤں یعنی زمینداروں کو نہیں جھیل سکتے تھے؟

شاید اب ان کے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ جابرانہ حکومت کے ظلم و استبداد کی بدولت بھوکے مر رہے تھے۔ ایسی موت مرنے سے بہتر انہوں نے یہ سمجھا کہ بغاوت کر کے — شان سے مرا جائے۔

اس طرح وہ ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بنگال کے ویربھوم اور سنتھال پرگنوں میں ان لوگوں کی قریب پچاس ہزار کی آبادی رہا کرتی تھی۔ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتروں کو لوٹ کر آگ لگادی۔ اور حملہ کر کے کچھ برطانوی آفیسران اور کچھ ایسے ظالم زمینداروں کو مار دیا جو اپنے ظلم کے لیے بدنام تھے۔ یہ باغی آزادی کے نغمے گاتے اور آزادی کی دھنوں پر رقص کرتے رہے۔ وہ ایک ساتھ چلاتے "ہم خدا کے بندے ہیں لیکن کسی کے غلام نہیں"

برطانوی سپاہی پہلی مرتبہ گھنے جنگلات میں گھس پڑے۔ انہوں نے نئے نئے طریقوں کو آزما کر اس بغاوت کو کچلنے کی پوری کوشش کی۔ ایک مرتبہ انہوں نے یہ حرکت کی کہ پچاس ہاتھیوں کو کوئی نشہ آور مشروب پلا کر پاگل کر دیا اور پھر انہیں قبائلی دیہاتوں پر چھوڑ دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں عورتیں اور بچے ان ہاتھیوں کے پیروں تلے کچل کر لقمۂ اجل بن گئے۔

سنتھالی جنگ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ جانتے تھے۔ حکمت عملی اور پالیسی جیسے الفاظ ان کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ وہ ایک جماعت بنا کر چپ چاپ کھڑے ہو جاتے اور دشمنوں کا انتظار کرتے۔ جب دشمن آتا تو وہ اس پر تیر چھوڑتے۔ اس کے برعکس دشمن ان پر گولیاں اور توپ کے

گولے برساتا۔ مگر کیا وہ ان گولیوں اور آگ کی بوچھار سے پیچھے ہٹے؟ نہیں۔ ہر گز نہیں۔ یہ ان کے طریق کے خلاف تھا۔ وہ اس وقت تک اپنی جگہ ڈٹے رہتے۔ جب تک دشمن نہ ہار جائے یا وہ خود نہ گر جائیں"

بہت سے برطانوی سپاہیوں نے سنتھالیوں کے اس عجیب و غریب طرز عمل کی شہادت دی ہے اور مشہور تاریخ داں — 'ہنٹر' — نے بھی ان واقعات کو تحریر کیا ہے۔ ایک برطانوی کپتان کا کہنا ہے کہ برطانوی فوج میں ہر سپاہی ان بھولے بھالے اور تقریباً نہتے سنتھالیوں سے جنگ پر شرمندہ تھا۔

برطانوی سپاہیوں کو یہ حکم تھا کہ وہ جس دیہات کو بھی دیکھیں اس پر جھپٹ کر حملہ کریں او دبوچ لیں۔ گھنے جنگل میں کسی دیہات کا پتہ لگالینا کوئی آسان کام نہیں تھا اس لیے حملہ آور فوج کو یہ ترکیب بتائی گئی کہ وہ درختوں کی چوٹیوں پر نگاہ ڈالیں اور جہاں دھواں اٹھتا دکھائی دے تو سمجھ لیں کہ وہاں کوئی بستی ضرور ہے۔

ایک روز برطانوی فوج ایسے ہی ایک دیہات میں پہنچی۔ اچانک ہی ان پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ یہ تیر ایک گھر کے اندر سے برسائے جارہے تھے۔ فوراً ہی برطانوی فوجیوں نے اس گھر کو گھیر لیا۔ اور اس گھر کی دیواروں میں سوراخ کر کے ان کے ذریعہ اندر گولیوں کی بوچھار کردی۔ پھر اس برطانوی فوج کے کپتان نے باغیوں سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیں۔ مگر اس کے جواب میں تیروں کی ایک نئی بوچھاڑ آئی۔ انہوں نے پھر ان باغیوں پر گولیاں برسانی شروع کردیں اور پھر سنتھالی زبان میں ان لوگوں سے ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ مگر اس کا جواب پھر تیروں سے دیا گیا۔

یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ ہر مرتبہ کی فائرنگ کے بعد تیروں کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جواب میں صرف ایک ہی تیر آنے لگا۔ آخر جب یہ ایک تیر بھی آنا بند ہو گیا تو فوجیوں نے دروازہ توڑا اور اندر گھس پڑے۔

اندر پہنچ کر انہوں نے جو نظارہ دیکھا وہ یہ تھا کہ یا تو لوگ مر چکے تھے یا مر رہے تھے۔ بس ایک

بوڑھا شخص اب بھی ہوش وحواس میں موجود تھا۔ یہ باقی بچا ہوا اکیلا آدمی بیچ گھر میں کھڑا ہوا تھا اور یہ وہی شخص تھا جس نے آخری تیر چلایا تھا۔ اس کے بعد اس کے داہنے بازو میں کئی گولیاں پیوست ہو گئیں اور وہ تیر چلانے کے قابل ہی نہ رہا۔

"آؤ اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو" برطانوی کیپٹن چلاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ آگے بڑھ کر اس شخص کو دبوچنا چاہتا تھا۔ اچانک ایک کٹار چمکی اور برطانوی کیپٹن کے سر کو دھڑ سے الگ کر گئی۔ اس بوڑھے شخص کا بایاں بازو ابھی بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔

ایک درجن بندوقیں تڑتڑائیں اور یہ بوڑھا بھی باقی لاشوں پر ڈھیر ہو گیا۔ اور تقریباً اسی وقت سے سنتھالیوں کی بغاوت بھی ختم ہوتی چلی گئی۔ ان میں سے پچیس ہزار جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

دستاویزات سے اس آخری تیر انداز کے نام کا پتہ تو نہیں چلتا۔ بہر حال ہم اسے جانتے ہیں۔ کیا نہیں جانتے؟ اس کا نام تھا "بہادری"۔

2

کِتّور کی بہادر رانی

شمالی مغربی کرناٹک کے لوگ آج بھی اپنے لوک گیتوں میں اس بہادر اور اعلیٰ نسب رانی کے ترانے گاتے ہیں جس نے تقریباً 150 برس پہلے اپنی ریاست کی آزادی کے لیے جنگ کی تھی۔

یہ تھی رانی آف کِتور۔ کِتور، کرناٹک میں ایک ریاست تھی۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں کِتور پر 'مَلاّ سرجا' کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ اس کی دو رانیاں تھیں رُودرمّا اور چنما، بڑی رانی کم گو تھیں اور راج پاٹ یعنی ریاستی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ مگر رانی چنما جانتی تھیں کہ ان کے شوہر کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ وہ ہمیشہ ہوشیار رہتی تھیں اور اپنے شوہر کی طرف سے مختلف شاہی فرائض انجام دیتی رہتی تھیں۔

مَلاّ سرجا کا 1816 میں انتقال ہو گیا۔ رانی چنما نے رودرمّا کے بیٹے — باپو صاحب — کو گدی پر بٹھا کر اپنے لڑکے کو اس کا محافظ یا باڈی گارڈ مقرر کر دیا۔ بدقسمتی یہ رہی کہ ان دونوں شہزادوں کا انتقال نوجوانی میں ہی ہو گیا۔ رانی کا دل ٹوٹ گیا۔ مگر وہ بڑی دور اندیش عورت تھی۔ انہوں نے مرتے ہوئے نوجوان راجہ کو ایک بیٹا گود دلوا دیا تھا۔ وہ ریاست پر خود حکمرانی کرتی رہیں اور اس بات کی منتظر رہیں کہ کب یہ گود لیا ہوا بیٹا جوان ہو۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ باقی زندگی کسی مقدس مقام پر سکون سے گزاریں گی۔

حکمراں کی حیثیت سے رانی چنما نے نہایت کامیابی حاصل کی۔ ان کی رعایا انہیں ماں اور دیوی سمجھتی تھی۔ وہ فراخ دل اور انصاف پسند رانی تھیں۔ دل کی نرم مگر اپنے اصولوں اور نصب العین

کے معاملات میں بڑی سخت تھیں۔ راج گھرانے میں عظیم سانحہ رونما ہو جانے کے باوجود بھی ریاست کتّور میں وقت ٹھیک ٹھاک گزر جاتا بشرطیکہ کچھ ایسے بدخواہ لوگ موجود نہ ہوتے جو اس کی پُرامن فضا کو درہم برہم کرنے کے درپہ تھے۔ اسی قسم کا ایک بدخواہ 'ٹھاکرے' بھی تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک عہدے دار تھا۔ وہ مسلح فوج کے ساتھ کتّور پہنچا اور دعویٰ کیا کہ کیونکہ باپو صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اس لیے اب یہ ریاست کمپنی کے اختیار میں آگئی ہے۔

یہ ایک حیران کن دعویٰ تھا اور شرمناک حد تک من مانا بھی۔ ریاست کتّور زیر ہو کر کبھی بھی کمپنی کے تحت نہیں آئی تھی۔ کمپنی کو یہ حق کبھی حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ ریاست کے معاملات میں دخل اندازی کر سکے اور کہاں یہ کہ وہ اس پر قبضہ کرنے کے حق کی بات کر رہی تھی۔

ٹھاکرے کو اتنی جرات ہو گئی تھی کہ اس نے رانی کو اپنے کیمپ میں بلا بھیجا۔ اس سے برہم ہو کر رانی صرف اتنا ہی کر سکی کہ اس نے اس بلاوے (سمّن) کو نظر انداز کر دیا۔ ٹھاکرے نے الٹی میٹم دیا مگر اس کی بھی پرواہ نہیں کی گئی۔ اس کے بعد اس نے کیا یہ کہ توپوں کا رخ محل کی جانب کر دیا اور پھر بذات خود زور سے یہ اعلان کر دیا کہ محل پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔

ابھی اس مغرور شخص کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی بازگشت بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ قلعہ سے ٹِڈّی دَل کی طرح رانی کے سپاہی نکلے اور انھوں نے کمپنی کی فوج پر ہلّہ بول دیا۔ کمپنی کے سینکڑوں سپاہی ڈھیر ہو گئے۔ ان میں کمپنی کے دو کیپٹن بلیک —— اور ڈِیٹن —— بھی تھے۔ ٹھاکرے نے آخری مرتبہ محل میں گھسنے کی کوشش کی۔ رانی چنما اس تمام کارروائی کی رہنمائی خود اپنے محل کی چھت سے کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے ایک لیفٹیننٹ کو اشارہ کیا۔ ایک بندوق کی نال سے ایک شعلہ لپکا اور اگلے ہی لمحہ ٹھاکرے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ وہی مغرور ٹھاکرے تھا جو تاریخ میں ایک فاتح کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

کمپنی کے بہت سے آفیسروں کو پکڑ لیا گیا۔ اس کے بہت سے سپاہی مارے گئے باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ رانی چنما کی سیدھی جنگ میں مکمل فتح تھی۔

کمپنی کے سربراہ اس شرمناک شکست سے بھونچکارہ گئے۔ ذلت کی بات یہ تھی کہ ایک چھوٹی سی ریاست کی رانی کے ہاتھوں انہیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی اس شکست پر تقریباً پاگل ہو گئے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات پر جہاں جہاں بھی ان کی فوجوں نے پڑاؤ ڈال لیے تھے ان کو کِتّور کی جانب کوچ کا حکم دے دیا گیا۔

انھوں نے فوراً ہی محل پر حملہ نہیں کیا۔ ان کے بہت سے آدمی محل میں قید تھے۔ (بعد میں ان قیدیوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ نہایت مہربانی اور عزت کا سلوک کیا گیا تھا) انھیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے محل پر حملہ کیا تو کہیں یہ قیدی نہ مارے جائیں۔

انھوں نے ایک گھناؤنی چال چلی۔ انھوں نے یہ یقین دہانی کرائی کہ اگر قیدی آزاد کر دیے جائیں تو پھر وہ بھی پر امن معاہدہ کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔

رانی چنما نے ان باتوں پر یقین کر کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ مگر ابھی یہ قیدی اپنے جتھے میں پہنچے ہی تھے کہ محل پر حملہ بول دیا گیا۔

رانی کے سپاہی بہادری سے لڑے۔ مگر کمپنی کی فوج کہیں بہتر اور کہیں زیادہ بڑی تھی اور وہ رانی کے گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ تخریبی کارروائی بڑی سوچ سمجھ کر کی گئی تھی۔ گولے بارود کے ساتھ ساتھ تمام مال خانہ (اسٹور) ہی آگ کی نذر ہو گیا۔ رانی کے سپاہی جنگ کرنے سے معذور ہو گئے۔ رانی چنما کو قید کر لیا گیا۔

انھوں نے اپنی آخری سانسیں "بیل ہونگل" کے قلعہ میں پوری کیں اور ایک قیدی کی حیثیت سے ہی 1829 میں ان کی وفات ہو گئی۔

بیلگام میں رانی چنما کا بڑا خوبصورت مجسمہ نصب ہے۔ رانی چنما جو ایک چھوٹی سی ریاست کی ملکہ تھیں مگر جنھوں نے جائز مقصد کے لیے جنگ کی۔ گھوڑے پر بیٹھیں رانی چنما ہمیں اس رانی جھانسی کی یاد دلاتی ہیں کہ جس کی قسمت میں تین دہائیوں بعد انہیں کے نقش قدم پر چلنا لکھا ہوا تھا۔

3

"سب سے بہتر اور سب سے بہادر"

"وہ حیرت زدہ کرنے والا نوجوان کون تھا جس نے ہمارے کیپٹن پر وار کیا اور اتنے بہت سے سپاہی مار ڈالے ؟ اس نے بجلی کی طرح ہماری صفوں کو چیر ڈالا پھر فوجی سپاہی اس طرح زمین پر گرتے چلے گئے جیسے ان پر آسمانی بجلی گر پڑی ہو"! یہ سوال ایک تھکے ہوئے برطانوی سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے اس وقت کیا جب وہ تمام دن کی لڑائی کے بعد گوالیار کے قریب ایک چھاونی میں آرام کر رہے تھے۔ یہ 1858 کا سال تھا۔

ساتھی نے قہقہہ لگایا اور کہا "نوجوان ؟ بلا شبہ وہ ان میں سب سے بہادر مرد تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھا وہ جھانسی کی رانی لکشمی بائی ہے"

تمام دنیا کی تاریخ میں ایسا شریف، باہمت نڈر قائد دوسرا نسوانی کردار نہیں ملے گا جس کا مقابلہ رانی لکشمی بائی سے کیا جا سکے ماسوائے فرانس کی نجات دہندہ جون آف آرک کے۔ جون آف آرک کی بات دوسری ہے۔ 'جون' کی طرح سے ہی لکشمی بائی بھی ایک عام گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ مگر نجومیوں نے اس کی جنم کنڈلی دیکھ کر ہی اس کی عظمت کا پتہ لگا لیا تھا۔ اس طرح ان کی شادی جھانسی کے راجہ گنگادھر راؤ سے ہو گئی۔ ابھی لکشمی بائی صرف اٹھارہ برس کی ہی تھیں کہ راجہ کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے راج پاٹ خود سنبھال لیا اور ایک مثالی حکومت قائم کی۔ جھانسی کے عوام ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایک برطانوی تجارتی کمپنی نے جس کا نام دی ایسٹ انڈیا کمپنی تھا ہندوستان میں ایک حکومت قائم کر لی تھی۔ مگر ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں

اب بھی یہاں کے دیسی حکمرانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔ کمپنی کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ان راجاؤں کے اختیارات ہڑپ کرتی جا رہی تھی۔

کمپنی کی سرکار نے ایک قانون بنایا کہ اگر کوئی ہندوستانی راجہ بے اولاد مر جائے تو اس کی سلطنت کمپنی کی ملکیت ہوگی۔ مگر ہندوستان کی قدیم روایت کے مطابق اگر کسی شخص کی اپنی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ کسی دوسرے بچہ کو گود لے سکتا تھا۔ رانی لکشمی بائی نے بھی ایک بچہ کو گود لے لیا تھا اور اسی کے نام پر سلطنت کا کاروبار چلا رہی تھیں۔ مگر کمپنی نے رانی یا گود لیے گئے بیٹے کے حکومت کرنے کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

کمپنی کی افواج ریاست پر قبضہ کرنے کی تیاری کر کے جھانسی پہنچ گئیں "کسی خود مختار ہندوستانی حکمراں پر حکم چلانے والے یہ غیر ملکی کون ہوتے ہیں؟ مجھ سے میری جھانسی کون چھین سکتا ہے؟ ذرا ہمت تو کر کے دیکھیں" رانی بجلی کی طرح کڑکی۔ اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے سپاہیوں نے کمپنی کے پڑاؤ پر ہلہ بول دیا اور اس کی فوج کی اچھی ٹھکائی کرتے ہوئے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ رانی کی پر امن حکومت پھر سے قائم ہو گئی۔ دن گزرتے گئے۔

جب رانی سفید بے داغ پوشاک زیب تن کر کے اپنے درباریوں اور کمانڈروں کے درمیان آتی تو وہ اپنے سر ایسے ہی احترام و عقیدت سے اس کے سامنے جھکا دیتے کہ جیسے کوئی پجاری دیوی کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے۔ رانی کے الفاظ ان میں جوش بھر دیتے اور ان کو نیا حوصلہ دیتے اور اس کی آنکھیں ایک نیا ولولہ۔ لیکن ہارے ہوئے انگریز اس سے جلتے اور جھانسی پر حملہ کرنے کے موقع کی تلاش میں تھے۔

جنوری 1858 میں دو بڑی برطانوی رجمنٹوں نے ہندوستان میں اس وقت موجود سب سے لائق برطانوی جنرل سر ہیو روز (Sir Hugh Rose) کی قیادت میں جھانسی پر دو طرف سے حملہ کر دیا۔ ان کے پاس طاقتور توپیں اور دوربینیں موجود تھیں جن کے ذریعہ وہ دور سے ہی اپنے نشانے (Target) سیٹ کر سکتے تھے۔

جیسے ہی وہ جھانسی کے قریب پہنچے تو انہوں نے قلعہ کے اندر موجود گولے بارود اور پانی کے ذخیروں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ گو کہ جھانسی کی توپیں برطانویوں کی توپوں کے مقابلہ میں کمتر تھیں مگر جو سپاہی انہیں چلا رہے تھے وہ برطانوی فوجیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہادر اور وفادار تھے۔ گو کہ دونوں طرف کے سینکڑوں سپاہی روز لقمۂ اجل بنتے رہے مگر برطانوی کئی دن تک آگے نہ بڑھ سکے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں کئی مقامات پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی جابرانہ حکومت کے خلاف ہندوستانی عوام ہتھیار اٹھا چکے تھے۔ اس بغاوت کو عام طور پر سپاہیوں کی بغاوت کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ اس کی ابتدا کمپنی کی فوج میں موجود کچھ ہندوستانی سپاہیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، اس بغاوت کے ایک بڑے ہیرو تانتیا ٹوپے تھے۔ جو اپنے ساتھ بیس ہزار سپاہیوں کا جتھا لے کر رانی جھانسی کی مدد کے لیے جھانسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بدقسمتی سے یہ مدد جھانسی کے لیے تباہی کا باعث بن گئی خوف زدہ برطانوی فوجی بے تحاشہ رانی کے قلعہ پر چڑھ دوڑے۔ قلعہ کے بہادر پہرہ داروں نے بہت سے حملہ آور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر غالباً قلعہ کے عقبی دروازوں میں سے کوئی ایک دروازہ خفیہ طور پر کسی محافظ نے حملہ آور فوجیوں کے لیے کھول دیا تھا۔ اس محافظ کو کسی ہندوستانی مخبر کے ذریعہ بھاری رشوت دی گئی تھی۔

رات کا وقت تھا جب برطانوی فوجیں قلعہ میں گھس آئیں۔ رانی نے مردانہ کپڑے پہنے اور اپنے گود لیے ہوئے بچہ کو اپنی کمر پر باندھا اور قلعہ سے باہر نکل آئیں۔ چند وفادار سپاہیوں نے ان کی مدد کی۔

رانی صاحبہ نے پہلے ہاتھی پر اور پھر گھوڑے پر سفر کیا اور ایک لمبا فاصلہ طے کر کے کالپی پہنچ گئیں۔ یہاں راؤ صاحب اور تانتیا ٹوپے ان سے آملے۔ راؤ صاحب ان نانا صاحب کے بھتیجے تھے کہ جن کے ذکر سے داستانیں کی داستانیں بھری پڑی ہیں (ان کے واقعات آپ بعد میں پڑھیں گے)۔ برطانوی فوج نے رانی کا پیچھا کیا اور وہ وہاں بھی پہنچ گئی۔ اس دوران میں رانی صاحبہ نے دیگر

کچھ راجاؤں کو بھی اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ وہ بھی برطانویوں کے خلاف جنگ میں کود پڑیں۔ اسی لیے انگریز انہیں اپنا دشمن نمبر اول ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔

رانی صاحبہ اور برطانوی فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ ہر مورچے پر رانی اپنی فوجوں کے ہمراہ پیش پیش رہتیں۔ ہاتھ میں تلوار لیے وہ توپوں کے گولوں اور بندوقوں کی گولیوں سے پیدا آگ کے سمندر میں کود پڑتی تھیں۔ ان کی ہمت اور جواں مردی کو دیکھ کر اکثر دشمن کی ہمت جواب دے جاتی۔ وہ اپنی ہمت سے کام لے کر دشمن کی فوج پر سیدھا وار کرتیں اور برطانوی فوج کی ساری عیاری دھری رہ جاتی۔ دشمن کو بار بار پیچھے ہٹنا پڑتا۔

اب اس وقت کے گوالیار کے حکمراں انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ رانی صاحبہ گوالیار میں گھس پڑیں۔ حکمراں کو قلعہ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ گوالیار کی فوجوں نے رانی صاحبہ اور ان کے دونوں وفادار ساتھیوں یعنی تاتیا ٹوپے اور راؤ صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ گوالیار ان وطن پرست فوجوں کے قبضہ میں آگیا تھا جو ملک کو کمپنی کی جارحیت سے آزاد کرانے کا بیڑا اٹھا چکی تھیں۔ اس بات نے انگریزوں کی جیسی کمر توڑی ویسی کسی نے نہیں۔ برطانوی گورنر جنرل نے خط لکھا کہ اگر گوالیار پر ان کا دوبارہ قبضہ نہ ہو سکا تو وہ فوراً ہی اپنا بوریا بستر انگلینڈ کے لیے گول کر لیں گے۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہی نکلا کہ انگریزی فوجوں نے اپنی تمام طاقت کے ساتھ "باغیوں" کی سرکوبی کے لیے گوالیار پر دھاوا بول دیا۔

دن بھر کی جنگ ختم ہونے والی تھی۔ رانی صاحبہ گھنٹوں سے مسلسل لڑ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ دشمن دم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن سہ پہر کے بعد کمپنی کی فوج کو تازہ دم فوجیوں کی ایک اور کمک پہنچ گئی تھی۔ رانی صاحبہ اور ان کے ساتھی تھک کر چور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ رانی صاحبہ کا پرانا وفادار گھوڑا بھی مر چکا تھا اور نیا گھوڑا جنگ کے حالات اور جنگی چالوں سے واقف نہ تھا۔ رانی واپس لوٹنا چاہتی تھیں لیکن دشمن نے نہایت غضب ناک ہو کر ان کا پیچھا کیا۔ تاہم رانی نے

پیچھے ہٹتے ہوئے بھی زبردست مقابلہ کیا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ رانی صاحبہ بحفاظت واپس آجاتیں۔ تب ہی ان کی نظر اپنی ایک وفادار کنیز پر پڑی جو ان کے ہمراہ مردانہ بھیس میں لڑ رہی تھی وہ بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ رانی ایک لمحہ کو ٹھہریں، اس دشمن سپاہی کو کاٹ ڈالا جس نے ان کی کنیز پر وار کیا تھا اور انھوں نے اس مرتی ہوئی کنیز کو باہوں میں لینے کی کوشش کی۔ اسی موقع پر دشمن کے کچھ اور سپاہی آپہنچے اور انہیں گھیر لیا۔ ہر سپاہی نے انہیں حتی الامکان نقصان پہنچایا۔ اکیلی ہونے کے باوجود بھی انہوں نے جتنے بھی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھیں موت کے گھاٹ اتار دیا یا انہیں ناکارہ بنادیا۔ ان کے زمین پر گرنے سے قبل ہی دشمن نے واپسی کا بگل بجادیا تھا۔

اگر دشمنوں کو یہ معلوم ہو تا کہ ان کی ازلی دشمن، عظیم لکشمی بائی اب زندہ نہیں رہی تو وہ اس کی لاش کو چھوڑ کر نہ جاتے، وہ تو اسے رانی کی فوج کا کوئی بہادر سپہ سالار سمجھے تھے، رانی کے وفادار ساتھی انہیں قریب کی جھونپڑی تک لے آئے، اور سانس جانے سے پہلے ہی رانی نے انھیں حکم دے دیا تھا کہ ان کا فوراً ہی داہ سنسکار کر دیا جائے تا کہ دشمن کے ناپاک ہاتھ ان کے جسم کو نہ چھو سکیں۔ جب انگریزوں کو یہ پتہ چلا کہ رانی کی موت ہو چکی ہے وہ خوشی خوشی ان کی نعش ہتھیانے پہنچے تو ان کو مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ مگر جان دے کر وہ مثالی کردار ہو گئیں۔ آنے والے تمام زمانوں کے لیے۔

ان سب (کرداروں) میں ایک نام سب سے بلند نظر آتا ہے اور جو ابھی تک عوامی یاد داشت میں محفوظ ہے۔ اور وہ نام رانی لکشمی بائی کا ہے جو جھانسی کی رانی تھی۔ محض ۲۰ سال کی نوجوان لڑکی جس نے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ جسے انقلابی لیڈروں میں سب سے بہادر اور سب سے اعلیٰ کہکر اس انگریز جنرل نے بھی پکارا جو اس سے لڑ رہا تھا۔

4

نانا ایک پراسرار شخصیت

برسوں پہلے جب میں ایک چھوٹا سا بچہ ہی تھا تو ایک سیاح کا ایک واقعہ پڑھ کر مجھے جھرجھری آگئی۔ ہمالیہ پہاڑ کی ترائی کے علاقہ کے کسی بنگلہ میں وہ تمام دن کا تھکا ماندہ آکر آرام کر رہا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ صنوبر کے پیڑوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر گھنا کہرا تیزی سے اتر تا آرہا تھا۔ سیاح نے گرمائی حاصل کرنے کے لیے تھوڑی سی آگ جلا رکھی تھی۔ اچانک اس کے پاس ایک بزرگ آکر بیٹھ گئے۔ ان کی داڑھی برف کی طرح سفید اور آنکھیں ستاروں کی مانند چمک رہی تھیں۔

اجنبی بزرگ 1857 کی سپاہیوں کی بغاوت کی بہت سی کہانیاں سنانے لگے۔ کافی وقت گذر گیا۔ تب ہی حیران سیاح نے بزرگ سے پوچھا آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟ بزرگ بولے "میں خود ان حالات سے گزرا ہوں۔ کیا تم نے نانا صاحب کا نام نہیں سنا؟"

اس سے پہلے کہ سیاح حیران ہو کر چیخ اٹھتا وہ بزرگ لڑکھڑاتے ہوئے سے اٹھے اور تاریکی میں غائب ہو گئے۔

جس کسی نے بھی سپاہیوں کی بغاوت کے بارے میں کچھ پڑھا یا تھوڑا سا بھی سنا ہے۔ وہ نانا صاحب کے کردار سے ضرور واقف ہو گا۔

نانا صاحب کو پیشوا باجی راؤ دوم نے گود لیا تھا۔ پیشوا مراٹھا حکمراں تھے جن کا سلسلہ عظیم شیوا جی کے وزیروں سے مل جاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کہنا تھا کہ پیشوا کو کسی کو گود لینے کا حق نہیں ہے۔

کیونکہ اگر وہ نانا کے حق کو تسلیم کر لیتی تو کمپنی کو ایک معاہدہ کی رو سے پیشواؤں کی سلطنت غصب کر لینے کے عوض آٹھ لاکھ روپے سالانہ کی زبردست رقم ادا کرنی پڑا کرتی۔ اسی لیے انہوں نے اعلان کر دیا کہ "نانا صاحب باجی راؤ کے وارث نہیں ہیں وہ پیشوا بھی نہیں ہیں"۔

1857 کا غدر شروع ہو گیا تھا۔ نانا صاحب اپنی بہادری اور مادر وطن کی محبت کے لیے بہت مشہور تھے۔ کانپور کے باغی سپاہیوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کی رہنمائی کریں۔ نانا صاحب اس کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پیشوائی کا اعلان کر دیا اور اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگوں کو شہر سے نکال باہر کریں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک بہت قابل کمانڈر کے تحت اپنی فوجی ٹکڑیوں کو نانا صاحب سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا۔ مگر نانا صاحب نے حملہ آوروں کو پرے دھکیل دیا۔ دو برس کے عرصہ میں انھیں کانپور میں کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور جب کان پور پر برطانوی کمانڈر ہیولاک کا قبضہ ہو گیا تو وہ اودھ اور کالپی میں لڑے۔ ایسے وقت میں بھی جب کہ حالات ان کے مخالف تھے۔ لیکن ان کی ہمت جوان تھی۔ کاش کچھ طاقتور ہندوستانی حکمراں ان کا ساتھ دیتے تو وہ اور جھانسی کی رانی ملکر ہندوستانی تاریخ کا رخ ہی موڑ دیتے۔

مگر دیسی حکمرانوں میں سے چند ایک نہ صرف یہ کہ حکومت برطانیہ کے وفادار کتے ہو گئے بلکہ ان بہادر اور عالی حوصلہ لیڈروں کی مخالفت کرنے میں بھی پیش پیش رہنے لگے۔ بالآخر نانا صاحب نیپال کی طرف چلے گئے۔ ایک طویل عرصہ تک برطانیہ نے انہیں زندہ پکڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن وہ ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ انھوں نے اپنے مخالف یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جنرل کو جو آخری خط لکھا تھا اس میں لکھا تھا کہ "آپ کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے کہ آپ ہندوستان پر قبضہ کر لیں اور مجھے مجرم قرار دیں؟ تم کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ کیا! تم یعنی فرنگی تو بادشاہت کرو اور ہم اپنے ہی ملک میں چور قرار دے دیے جائیں"؟

آخر میں مخبروں نے خبر دی کہ نانا صاحب کو تو جنگل میں ایک شیر پھاڑ کر کھا گیا ہے۔ مگر کمپنی

کے افسران نے اس خبر پر یقین ہرگز نہیں کیا۔

سرکاری آفیسر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے نانا صاحب کو پکڑنے کے لیے مقابلہ آرائی کرتے۔ وہ کبھی تو فقیروں کو نانا صاحب سمجھ کر گرفتار کر لاتے اور کبھی درویشوں کو۔ کمپنی کی حکومت اس وقت تو ایک دم گھبرا اٹھی جب اسے یہ اطلاع ملی کہ نانا صاحب روسی فوج کے سربراہ کی حیثیت سے عنقریب ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے ہیں!

مگر کیا جاسوسوں نے نانا صاحب کی موت کی اطلاع صحیح دی تھی؟ شاید نہیں۔ کیوں کہ نیپال میں ایک جنگل کے کنارے بسے ایک گاؤں میں ان کی بیوی اکیلی رہتی تھیں۔ اور وہ بیواؤں کی طرح کا لباس پہننے سے انکار کر دیتی تھیں۔ لوگوں کو یقین تھا کہ تہواروں کے موقعوں پر نانا صاحب اپنی خفیہ پناہ گاہ سے چپ چاپ نکل کر اس سے ملنے آتے ہیں۔

نانا صاحب کی کہانی نہایت تیزی سے پورے ہندوستان میں اور اس سے باہر مشہور ہو گئی۔ بہت سے انگریز مصنفوں نے ان کے بارے میں کافی کچھ لکھا مگر وہ انھیں شیطان بنا کر ہی پیش کیا کرتے تھے۔ وہ جیولس ورنیس کے ایک ناول کا کردار تھے، دکھایا گیا جس میں کہ ایک طویل عرصہ کے بعد نانا صاحب ایک راہ چلتے فقیر کی حیثیت سے ہندوستان واپس آئے۔

ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ نانا صاحب بہت عرصہ تک زندہ رہے۔ کچھ لوگوں نے تو یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ نانا صاحب سے ملے تھے۔

5
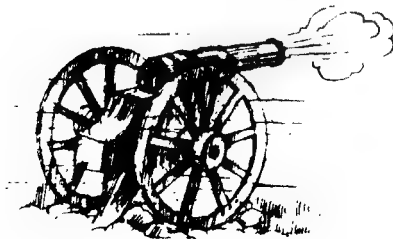
کلرک جو کمانڈر بن گیا

یہ1858 میں نومبر مہینہ کاایک دن تھا کہ کان پور کے لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک بڑی برطانوی فوج تیزی سے ان کے شہر کی جانب بڑھتی چلی آرہی ہے۔ کیا یہ شہر پر قبضہ کرنے آرہی ہے؟اگرایسا ہے توسپاہی اتنے کمزور کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟کوئی شخص بھی مزاحمت نہیں کررہاتھا!وہ لوگ اتنی آسان جیت پر خوش کیوں نہیں ہیں؟لوگ حیران تھے۔

جو سوالات ان کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے ان کا جواب انہیں بٹالین کے پیچھے سے آتی ہوئی توپوں کی گھن گرج اور طوفانی قہقہوں کی آواز سے مل گیاجو شہر کے قرب وجوار میں واقع کھیتوں اور جنگل کی طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج شہر پر قبضہ کرنے نہیں آئی تھی۔اس کا تو پیچھا کیا جارہا تھااور وہ اپنی جان بچانے کے لیے شہر میں گھس گئی تھی۔ کئی دنوں سے باغی ہندوستانیوں کی فوج ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ باغی نہ تو فوج پر حملہ ہی کرتے تھے اور نہ ہی اسے چین سے رہنے دیتے تھے۔ وہ تو اسے صرف پریشان کر رہے تھے۔ وہ یا تو کبھی کبھی چند ایک گولیاں۔داغ دیتے یاپھر چند تیر پھینک دیتے۔ کبھی ان کی پشت سے حملہ کرتے یارات کو خوفناک نعرے لگا کرانہیں خوفزدہ کر دیتے۔

یہ سب کچھ اس وقت تک جاری رہاجب تک کمپنی کی فوج امان کی تلاش میں کانپور تک نہیں پہنچ گئی۔اوراب باغیوں کے حملہ کرنے کاوقت آگیا تھا۔اس سے پہلے کہ فوج اپنے آپ کواز سر نو منظم کرتی باغی توپوں سے ان پر آگ کے گولے برسا کرانگریزی فوج کو کھلی لڑائی کے لیے للکارنے لگے۔

انگریزی فوج کا کمانڈر ونڈ ہیم(Wyndham) تھا جو ایک تجربہ کار اور منجھا ہوا جنرل تھا، اس جنرل کی فوج بھی نہایت منظم تھی۔

لیکن اس کے باوجود جنرل کی ذاتی صلاحیت اور اس کی فوج کی بہادری ہندوستانی افواج کے سامنے بیکار ثابت ہوئیں۔ جو شخص باغیوں کی رہنمائی کر رہا تھا وہ نہ تو کوئی تربیت یافتہ سپاہی تھا نہ ہی کسی جنگ جو برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ تو ایک برہمن تھا۔ اس کا نام تھا تاتیا ٹوپے۔ یہ شخص 1857 کے غدر سے پہلے تک نانا صاحب کے دربار میں ایک کلرک تھا۔ اپنی مضبوط قوتِ ارادی، مادر وطن کی شدید محبت اور اپنے آقا کے تئیں سچی وفاداری نے اس شخص کو ایک بہادر سپاہی اور ایک قابل کیپٹن بنا دیا تھا۔ اس نے بیس ہزار سپاہیوں کی فوج کی رہنمائی کی۔ اس شخص نے انہیں اتنے عمدہ طریقہ سے منظم کیا تھا اور خود بھی ایسی حیرت ناک بہادری اور بیباکی سے لڑتا تھا کہ برطانوی کمانڈروں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ ایک غیر معمولی لیڈر تھا۔

جب اس نے کمپنی کی فوج کا پیچھا کر کے اسے کان پور میں دھکیل دیا تو پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد ایک خوفناک جنگ ہوئی جو تمام دن جاری رہی۔ اس دن کے خاتمہ پر ایک برطانوی افسر نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

تم اس دن کی لڑائی کے واقعات پڑھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ تمہیں پتہ چلے گا کہ انگریز فوج جو بہادری کے لیے بڑی مشہور تھی وہ کس طرح اپنا مال و متاع اپنا کیمپ اور اپنا نشان امتیاز یہاں تک کہ اپنے ہندوستانی مخبروں کو بھی چھوڑ کر بھاگ گئی۔

جیسا کہ دشمن نے ان کو صحیح نام دیا، ہارے ہوئے فرنگی، نہایت بے ترتیبی سے اپنے اجڑے ہوئے خیموں سپاہیوں کے لٹے ہوئے ساز و سامان، بھاگتے ہوئے ہاتھی اونٹ گھوڑوں اور خادموں کے بیچ کمین گاہوں میں چھپ گئے۔ یہ سب بہت شرمناک اور تکلیف دہ ہوا"۔ (چارلس بل کی کتاب انڈین میوٹنی سے ماخوذ)

مگر تاتیا ٹوپے کی قسمت میں کچھ غیر یقینی تھا۔ انہوں نے ونڈ ہیم کو تو شکست دے دی، لیکن

ہندوستان میں موجود برطانوی فوج کے سپہ سالار اعظم سر کولن کیمپ بیل (Sir Colin Campbell)جو اس وقت لکھنؤ میں باغیوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھے ونڈ ہیم کی شرمناک شکست کی خبر سن کر فوراً اسکی مدد میں کو دوڑ پڑے ٹوپے کو یہ امید نہیں تھی کہ کیمپ بیل اتنی جلدی کانپور پہنچ جائے گا۔ انھیں یہ خیال تھا کہ لکھنؤ کی لڑائی اسے کافی عرصہ تک اپنے میں ہی الجھائے رکھے گی۔

کیمپ بیل اپنی بہترین فوج اور ماہر افسران کے ہمراہ کانپور پہنچ گیا۔ اگر ٹوپے کو کانپور پر مکمل قبضہ کرنے اور حالات قابو کرنے کے لیے چند دن اور مل گئے ہوتے تو معاملہ دوسرا ہوتا اور کیمپ بیل کو اپنی زندگی کا سب سے مشکل وقت دیکھنا پڑتا۔ مگر ایسا ہونا نہیں تھا۔

ٹوپے کو کالپی واپس لوٹنا پڑا۔ انھوں نے مادر وطن کے کئی راجاؤں اور نوابوں کو پیغام بھجوایا:
"میرے آقا (ناناصاحب) نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی حمایت اور دشمن کو ختم کرنے کے مقصد سے اپنے تمام مفادات اور عیش و عشرت کی بلی چڑھادی۔ ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ طاقتور راجاؤں اور نوابوں کی سلطنتوں اور جاگیروں پر قبضہ کرلیں اور ان پر اپنی مستقل برتری قائم کرلیں۔ اس کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی راجہ و نواب اپنی اپنی سلطنتوں اور جاگیروں پر ایسے ہی قابض و قائم ہو جائیں جیسے وہ پہلے تھے۔ بشرطیکہ آپ لوگ بہادری سے ان کا ساتھ دیں تاکہ ملک میں مکمل امن و چین قائم ہو سکے۔"

ٹوپے جلد ہی اتنے بااثر ہو گئے کہ ایک برطانوی آفیسر لکھنے پر مجبور ہو گیا:
"جب تک کالپی پر باغیوں کا قبضہ ہے، تب تک دشمن (ہندوستانی باغی) یہ کہنے کی طاقت رکھتا ہے کہ چاہے ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک انگریزوں کا قبضہ ہو لیکن اس کی کلید تو انہیں (باغیوں) کے ہی ہاتھ میں ہے"

اس لیے برطانوی اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک ٹوپے زندہ رہے۔ وہ سر کولن کیمپ بیل کا خاص نشانہ تھے۔ کئی لڑائیاں ہوئیں۔ ٹوپے میں لوگوں کے جذبات بھڑکانے اور ان میں

حوصلہ پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ وہ تقریباً روزانہ اتنے ہی نئے سپاہی اور بھرتی کر لیتے تھے جتنے دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں عوام اور راجاؤں کی حب الوطنی پر بھی مکمل بھروسہ تھا۔

مگر کچھ راجاؤں نے ان سے غداری کی۔ ایک مرتبہ ایک جنگ میں پسپا ہو کر ٹوپے تھک گئے اور زخمی ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ایک پرانے دوست — راجہ نرو کر — کے یہاں پناہ لے لی۔ ان کے اس 'دوست' نے انگریزوں کو خبر کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کی۔

شاداں و فرحاں انگریز انھیں سپری لے گئے اور ایک جھوٹا مقدمہ چلا کر انھیں پھانسی پر چڑھا دیا۔

ٹوپے کو کوئی افسوس نہیں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نوکروں کو شرمندہ کر دینے والی آواز میں انھوں نے اپنی موت کو گلے لگانے سے پہلے کہا کہ وہ اپنے حق اور انصاف کے لیے لڑے ہیں اور یہ کہ کوئی بھی انھیں یہ باور نہیں کرا سکتا کہ انھوں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔

6
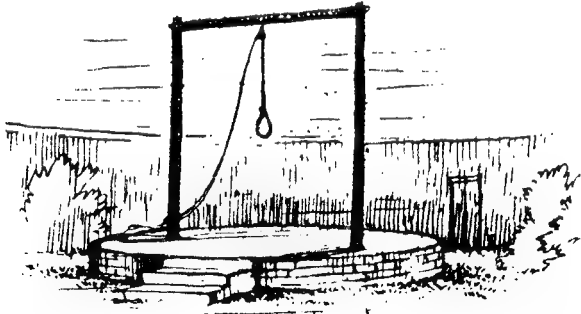
پچھتر سال کا جوان

اُس کی داڑھی سفید تھی اور جلد پر جھرّیاں تھی
وہ بظاہر بوڑھا تھا
لیکن راجہ کمار سنگھ سے زیادہ جوان دل اور ذہن کا مالک کون ہو سکتا تھا؟،

یہ ایک لوک گیت کا مضمون ہے بلا شبہ کمار سنگھ نے (جنہیں کنور سنگھ بھی کہتے ہیں) جس وقت 1857 میں بدیسی حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے وہ پچھتر سال کے جوان تھے۔

وہ بہار میں ایک ریاست جگدیش پور کے راجہ تھے۔ ان کے خاندان میں ایک قدیم روایت پر یقین کیا جاتا تھا، جس کے مطابق ان کا تعلق اجین کے راجہ عظیم وکرمادتیہ سے تھا۔

کمار سنگھ جب چھوٹے سے بچے تھے تو جگدیش پور کے قریبی جنگل میں انہیں آنکھ مچولی کھیلنا بہت پسند تھا۔ جوان ہوئے تو بھی انہیں جنگل بہت اچھا لگتا تھا مگر اب وہ آنکھ مچولی کے بجائے مصنوعی گوریلا جنگ لڑنے کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو دو جتھوں میں تقسیم کر دیتے اور پھر ایک جماعت اچھل کر دوسری جماعت پر حملہ کر کے اسے دبوچ لینے کی کوششیں کرتی، یہ ان کا روز کا کھیل تھا۔

اور پھر 1857 کی بغاوت میں کمار سنگھ کا یہ کھیل ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بڑا خطرناک ثابت ہوا۔ اپنے مٹھی بھر غیر تربیت یافتہ اور بھولے بھالے لوگوں کی جماعت سے انہوں نے کریمیا مہم

کے شہرت یافتہ لارڈ مارک کیر اور جنرل لی گرینڈ کی سربراہی میں لڑنے والی انگریزی فوجوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ کریمیا مہم کے شہرت یافتہ لارڈ مارک کیر اور جنرل لی گرینڈ کو شکست فاش دے ڈالی۔

جب کمار سنگھ مقابلہ کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھے اس وقت برطانویوں نے جگدیش پور پر قبضہ کر لیا۔ وہ وہاں سے بھاگ گئے۔ لیکن موقع کا انتظار کرنے لگے۔ مادرِ وطن کے اس سچے سپوت کا ارادہ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ جگدیش پور سے غیر ملکیوں کو بھگا دیں بلکہ وہ پورے ملک سے ہی ان کا تسلط ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے نانا صاحب کی پکار پر وہ فوراً ہی اپنے سپاہیوں کے ہمراہ کانپور پر دھاوا بولنے چل پڑے۔ اس کے بعد ہی جب انہیں معلوم ہوا کہ برطانوی لکھنؤ کی طرف بھی بڑھ رہے ہیں تو انھوں نے اپنا رخ لکھنؤ کی جانب موڑ دیا اور وہاں مقابلہ کیا۔

مختلف مقامات پر کامیاب معرکوں کے بعد، جن میں سے کچھ میں کمار سنگھ کو یقینی فتح حاصل ہوئی اور کچھ میں ان کے سپاہیوں نے دشمن کو خوفزدہ کر کے بھگدڑ مچا دی تھی، انھوں نے واپس گھر آنے کا فیصلہ کیا۔

برطانوی اس بات کا تہیہ کر چکے تھے کہ انھیں جگدیش پور واپس نہیں آنے دیں گے۔ انھوں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کا پیچھا کیا۔ مگر کمار سنگھ بے خوف و خطر آگے بڑھتے گئے۔ اگر ان کے دشمنوں سے موازنہ کیا جائے تو ان کے پاس صرف چند ہزار افراد پر مشتمل ایسی فوجی ٹکڑی تھی جس کے پاس نہایت کمتر درجہ کے ہتھیار تھے۔ اس کے باوجود بزرگ کمار سنگھ نے اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر چمچماتی تلوار ہاتھ میں لے کر نہایت چابکدستی سے اور مثالی انداز میں اپنی فوج کی ایسی بے مثال رہنمائی کی کہ اپنے سے کہیں زیادہ بہتر و برتر برطانوی فوج کو شکست پر شکست دیتے چلے گئے۔

شدید مقابلہ کے دوران دشمن کی ایک گولی سے ان کی داہنی کلائی زخمی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ اگر ہاتھ کو کاٹ نہ دیا گیا تو زہر تمام جسم میں پھیل جائے گا اور پھر جان کو بھی خطرہ پیدا

ہو جائے گا۔

اب اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کسی طبیب کو مدد کے لیے بلایا جاتا۔ کمار سنگھ گنگا کے کنارے کھڑے ہوگئے اور بولے "ماں! اپنے بچہ کی طرف سے یہ قربانی قبول کیجئے" یہ کہہ کر انھوں نے بائیں ہاتھ سے تلوار پکڑی اور ایک ہی وار میں اپنا داہنا ہاتھ کاٹ کر دریا میں پھینک دیا۔

اگر وہ کچھ زیادہ جوان ہوتے تو شاید اپنے اس عجیب و غریب آپریشن کو برداشت کر جاتے کیونکہ ان میں قوت ارادی بہت زیادہ تھی۔ مگر دو برس کی مسلسل جنگ نے انھیں جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ وہ اگلے دن یعنی 24/اپریل 1858 کو انتقال کر گئے۔

اس کے بعد بھی جگدیش پور کا برطانویوں کو دیا ہوا چیلنج ختم نہیں ہو گیا۔ کمار کے چھوٹے بھائی امر سنگھ نے اس فوجی تحریک کی کمان سنبھال لی اور برطانویوں کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہے جب تک کہ ان کا قلعہ دشمنوں نے فتح نہ کر لیا۔

امر سنگھ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور روپوش ہو گئے۔ ان کے آخری دنوں کے بارے میں تاریخ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔

7
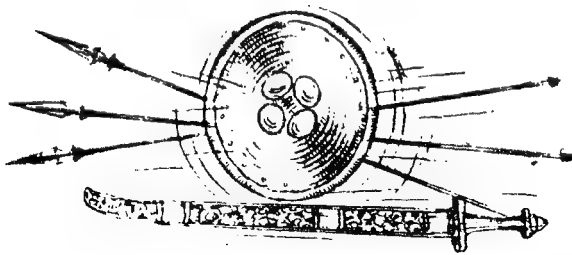
ہندوستانی 'ناتھن ہیل'

نیویارک کے سٹی ہال پارک میں ایک خوبصورت مجسمہ ناتھن ہیل کا نصب ہے۔ یہ امریکہ کی آزادی کی لڑائی میں اس نوجوان کی بے مثال قربانی کی یاد دلاتا ہے۔

اس نے ایک جاسوس کے بھیس میں انگریزوں کے کیمپ میں گھس کر وہاں سے جنگی تیاریوں کی انتہائی ضروری معلومات اکٹھا کر کے اپنے جنرل جارج واشنگٹن کو مہیا کی تھیں۔ جب وہ انگریزوں کے ہاتھ لگا تو اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

امریکی اسکولوں کے طلبا ناتھن ہیل کے پھانسی پر لٹکنے سے ایک منٹ پہلے کہے گئے قول کو دہراتے ہیں جب اس کے جلاّد نے طنزیہ طور پر چیخ کر اس سے کہا تھا "اے خوبصورت نوجوان اب تم اپنے لیے کیا کہتے ہو؟" ناتھن نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا "مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ اپنے ملک پر قربان ہونے کے لیے میرے پاس صرف ایک ہی زندگی ہے"

کانپور اور لکھنؤ کے درمیان کہیں مٹی میں محمد علی خاں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ انھیں ہندوستان کا 'ناتھن ہیل' کہا جاتا ہے۔ جس آخری شخص کی ان سے گفتگو ہوئی تھی وہ ایک انگریز فوربس میکیل (Forbes Mitchell) تھا۔ مگر وہ ناتھن ہیل کے جلاّد کے برعکس ایک نرم دل انسان تھا۔ محمد علی کو صبح کے وقت ختم کیا جانا تھا۔ وہ دونوں ساری رات باتیں کرتے رہے ہو سکتا ہے کہ فوربس میکیل کے ورثا کے پاس آج بھی وہ سونے کی انگوٹھی موجود ہو جو محمد علی نے اپنے نگراں کو تحفۃً پیش کی تھی۔ اس کا ذکر بعد میں فوربس میکیل نے ایک تحریر میں اس طرح کیا تھا:

"میرے پاس اب بھی وہ انگوٹھی موجود ہے، اس بغاوت کے مال غنیمت میں سے یہی چیز میرا حصہ کہی جا سکتی ہے۔ اور میں اسے اپنی اولاد کو محمد علی خاں کی تاریخ کے ساتھ سونپنا پسند کروں گا۔"
(دی ریلیف آف لکھنؤ مصنفہ ولیم فوربس میکیل)

کان پور سے باہر مقیم فوربس میکیل 93 ویں سدرن لینڈ ہائی لینڈرس رجمنٹ کا ایک آفیسر تھا۔ سپاہیوں کی ملاقات اکثر ایک "پلم کیک والے" سے ہوتی تھی۔ جس کا نام جیمی گرین تھا۔ یہ ایک خوش لباس او بہت زیادہ خوبصورت شخص تھا۔ اپنے عمدہ تراش والے گل موچھوں اور موچھوں پر اتراتا پھرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ وہ انگریزی بڑی روانی سے اور فرّاٹے دار بولتا تھا۔ انگریز سپاہی اس کے بنائے ہوئے مزیدار کیک پسند کرنے کے علاوہ اس کی سمجھداری کی باتوں سے اتنے محظوظ ہوتے تھے کہ کبھی یہ سوچتے ہی نہیں تھے کہ اتنا تعلیم یافتہ اور اتنا قابل آدمی ہو کر بھی آخر اس نے اپنا ذریعہ معاش اس کیک فروشی کو کیوں بنا رکھا ہے؟ اگر یہ سوال جیمی گرین سے بھی کیا جاتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جھٹ سے اس کا کوئی نہایت مناسب جواب پکڑا دیتا۔

ایک ہندوستانی سپاہی کی حیثیت سے وہاں سے اکٹھا کی گئی معلومات کے ساتھ وہ فرار ہو سکتا تھا۔ ایک بار وہ ان سپاہیوں کے ساتھ شامل تھا جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لیکن اب وہ باغیوں سے بیوفائی کر کے دشمن کے کیمپ میں آکر شامل ہو گئے تھے۔

ایک سپاہی نے جیمی کا تیار کیا ہوا کیک تو کھا لیا مگر اس کی قیمت ادا کرنے سے کترا رہا تھا۔ اس سے جیمی نے کہا:

"لطیفہ تو لطیفہ ہی ہوتا ہے مگر کسی کا بنایا ہوا مزیدار کیک کھا کر قیمت ادا کرنے سے انکار کرنا ہائی لینڈ کا لطیفہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے!"

لوگ اس جملہ پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ جیمی دن بہ دن مقبول ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مگر ایک غدار سپاہی نے اسے پہچان لیا۔ اس نے برگیڈیئر کو کیک والے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ فوج کے افسران اس بات سے سخت ڈرے کہ وہ دراصل روہیل کھنڈ کے ایک شاہی خاندان کا فرد محمد علی خاں

تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئر تھا جو دو مرتبہ انگلینڈ جا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ نیپال کے ہز ہائی نیس جنگ بہادر کے سیکریٹری کی حیثیت سے گیا تھا اور دوسری بار نانا صاحب کے سفارتی نمائندہ کی حیثیت سے! اور یہ کہ اس نے ہائی لینڈرس کے منصوبوں کی جو اطلاعات اکٹھی کی تھیں اگر وہ انھیں لے کر فرار ہو جاتا تو اس سے باغیوں کو بے حد فائدہ پہنچتا۔

بریگیڈیر میجر کے حکم پر اسے چند سپاہیوں نے دبوچ لیا اور رات بھر اسے فوربس میکیل کی نگرانی میں چھوڑ دیا گیا۔

جو سپاہی کبھی اس کے لطیفوں کا مزہ لیا کرتے تھے اب وہی جوش میں آکر اس کے ساتھ بھیانک مذاق کر رہے تھے۔ انھوں نے سور کا گوشت لیا اور مارنے سے پہلے اس کو یہ گوشت زبردستی کھلا کر اس کا مذہبی ایمان خراب کرنا چاہتے تھے۔ مگر فوربس میکیل نے اس بے سہارا قیدی کے ساتھ انھیں ایسا برتاؤ نہیں کرنے دیا۔ اسی علاقہ کے ایک دکاندار سے انھوں نے محفوظ کھانے کا انتظام کیا اور محمد علی کے پاس ہی بیٹھ گئے اور ساری رات جاگتے رہے۔ انھوں نے ایسا کچھ تو اس لیے کیا کہ کہیں وہ قیدی فرار نہ ہو جائے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ وہ اس سے متاثر ہوئے تھے۔

فوربس میکیل نے اس گفتگو کا جو ریکارڈ چھوڑا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد علی نہ صرف یہ کہ ایک وطن پرست اور پکا اصول پرست تھا بلکہ نہایت بہادر اور شاندار انسان بھی تھا۔ اسے پتہ تھا کہ چند گھنٹوں میں ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی مادر وطن کی خاطر داؤ پر لگا دی تھی۔ اس نے کہا:

"حالانکہ ہم اپنے ملک کو انگریزوں سے نہیں چھڑا پائے ہیں لیکن ہم نے پھر بھی کچھ اچھا ہی کیا ہے اور یہ کہ ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی.......... میرے ملک کے دبے کچلے لوگوں کے سامنے بہر حال ایک مستقبل موجود ہے۔ گو کہ میں اس وقت زندہ نہیں ہوں گا۔

محمد علی خاں نے فوربس میکیل کے دماغ سے ہندوستان کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کر دیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ باغیوں نے یوروپی عورتوں کی بے عزتی کی تھی تو اس نے جواب دیا:

"صاحب آپ اس ملک میں اجنبی ہیں ورنہ اس قسم کا سوال نہ پوچھتے۔ جو شخص بھی اس ملک کے رسم ورواج کے متعلق کچھ جانتا ہے اس کو معلوم ہے کہ اس قسم کی تمام کہانیاں جھوٹی ہیں۔ انھیں گھڑنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کو زیادہ بڑھایا جائے جبکہ کافی نفرت پہلے سے موجود ہے"۔

اس نے مکمل یقین واعتماد کے ساتھ ان کہانیوں کو بھی من گھڑت قرار دیا جو انگریزوں کے باغیوں کو کچلنے سے متعلق پھیلائی گئی تھی۔

صبح نمودار ہوئی۔ محمد علی نے نماز ادا کی اور پھر فوربس میکیل کا بہت شکریہ ادا کیا۔ فوربس میکیل کے رکارڈ سے پتہ چلتا ہے "اس نے صرف ایک اور صرف ایک مرتبہ کچھ کمزوری اس وقت دکھائی کہ جب وہ اپنی بیوی اور دو بیٹوں کا ذکر کر رہا تھا۔ جو روہیل کھنڈ میں تھیں۔ وہ کہنے لگا کہ انہیں اپنے بد نصیب باپ کے انجام کا پتہ ہی نہیں لگ پایا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور کہنے لگا میں نے فرانسیسیوں اور انگریزوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے مجھے دنیٹن کو یاد رکھنا چاہئے اور کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔"

اس وقت چند سپاہیوں نے آکر قیدی کا چارج لے لیا۔ کچھ دیر بعد فوربس میکیل لکھنؤ کے سفر پر روانہ ہوا تو اس نے اپنے اس ایک رات کے مہمان کو سڑک کے کنارے ایک درخت سے مردہ حالت میں لٹکے ہوئے دیکھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آگے چل پڑا۔

8

گمنام مجاہد

جب یہ واضح ہو گیا کہ 1857 کی بغاوت کا اب خاتمہ ہونے والا ہے اس کے تمام باغی لیڈر یا تو موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے یا روپوش ہو گئے تھے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج اور آفیسران نے ہندوستانی عوام کے تئیں ظلم کی انتہا کر دی۔ انھوں نے ہزاروں بے قصور مردوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ان لوگوں کو اس حد تک خوف زدہ کر دیں کہ آئندہ وہ بغاوت کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔

کمپنی کی افواج کے ہاتھوں اس طرح کے ظلم و زیادتی کے سینکڑوں واقعات انگریزوں نے رکارڈ کیے ان واقعہ نگاروں میں سب سے نمایاں نام "دی ٹائمس" لندن کے خصوصی نامہ نگار ولیم ہاورڈ رسل کا ہے۔

> "ایک مرتبہ ایک درجن لوگوں کو محض اس۔ لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ جب فاتح فوج کی ٹکڑی ان کی سمت بڑھ رہی تھی تو یہ لوگ 'دوسری سمت' میں دیکھ رہے تھے"۔

ایک بار ایک چھوٹا سا بچہ جو نابینا شخص کی لاٹھی پکڑ کر چل رہا تھا کمپنی کے آفیسر کے پیروں پر گر کر جاں بخشی کی منت کر رہا تھا لیکن اس آفیسر نے ایک دم "اپنا ریوالور نکال لیا اور رحم طلب کرتے ہوئے اس بیچارے کے سر پر تڑ سے داغ دیا۔ مگر کسی وجہ سے ریوالوار نے کام نہیں کیا اس نے پھر ٹریگر کھینچا۔ ایک بار پھر ریوالور نے کام نہیں کیا۔ اس نے تیسری بار پھر چلانا چاہا۔ وہ پھر نہیں چلا۔

آخر چوتھی مرتبہ — یعنی اس بہادر آفیسر کو سدھرنے کے تین موقع ملنے کے بعد — وہ آخر چل ہی گیا اور اس بچہ کا تازہ تازہ خون اس آفیسر کے پیروں پر تھا"۔

ایک مرتبہ کچھ قلی ایک دیوار کے سائے میں آرام کر رہے تھے "اچانک اچھلتا کودتا اور دہاڑتا ہوا ایک درندہ نما برطانوی فوجی ان پر آپڑا۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ بھورے رنگ کی اس کے کسے ہوئے ہیلمٹ سے نکلتی ہوئی بالوں کی بد نما لمبی لمبی لٹیں لٹک رہی تھیں۔ ایک لمبی چھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ قلیوں پر چڑھ دوڑا اور بیچارے قلی گاجر کی طرح روند دیے گئے"۔

یہ ان فاتحین کے کارناموں کے صرف چند قصے ہیں۔ ہارنے والوں نے کیا کیا؟ کیا وہ سب ہمت ہار بیٹھے؟ آیئے فوربس میکیل کی تحریروں میں ہی دیکھیں۔

یہ واقعہ لکھنؤ کے قریب ایک باغ میں پیش آیا۔ اس دن میکیل کی فوج نے "صرف" 2000 ہندوستانیوں کو قتل کیا تھا۔ چلچلاتی دھوپ کی وجہ سے فوجی تھک بھی گئے تھے اور پیاسے بھی تھے۔

یہ فوجی اس باغ میں آرام کرنا اور شاید اپنے خون میں رنگے ہاتھ دھونا چاہتے تھے۔ اس باغ کے ایک کنارے پر ایک بڑا پیپل کا درخت کھڑا تھا۔ اس درخت کے نیچے کچھ مٹکے قطار سے رکھے ہوئے تھے۔

فوجیوں نے سوچا شاید ان مٹکوں میں پانی ہو چنانچہ کچھ فوجی ان کی طرف دوڑ پڑے اور ان کے قریب پہنچ کر بیٹھ گئے۔

مگر انھیں دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ نامعلوم سمت سے گولیاں آئیں اور انھیں ڈھیر کر گئیں۔

حیران و پریشان کیپٹن نے ایک سپاہی کو اس درخت کی گھنی شاخوں اور چوٹیوں کا غور سے مشاہدہ کرنے کو کہا اس نے چوٹی پر موجود دشمن کا پتہ لگا لیا اور فوراً ہی نشانہ لے کر گولی داغ دی۔

لال رنگ کی جیکٹ اور گلابی رنگ کے ریشمی پائجامہ میں ملبوس ایک لاش پیڑ سے نیچے گری۔

یہ ایک جوان عورت کی لاش تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کے پاس ایک طرز کی پستول (کیولری پسٹل) تھی۔ ایک بھرا ہوا پستول اب بھی اس کی پیٹی میں اڑسا ہوا تھا۔ اور اس کے کارتوسوں کی پیٹی

اب بھی تقریباً آدھی بھری ہوئی تھی۔ حملہ سے پہلے اس نے درخت پر بڑی ہوشیاری سے مچان بنائی تھی۔ اسی مچان پر بیٹھ کر اس خاتون نے آدھے درجن سے بھی زیادہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

ہمیں یہ کبھی معلوم نہیں ہوسکے گا کہ وہ کون تھی۔ مگر اس کے حلیہ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے مادر وطن اور شاید خاندان کے ساتھ ہوئے ظلم کا انتقام لے رہی تھی۔ مگر وہ ان میں سے صرف ایک تھی کہ جنھوں نے ہمت و جوانمردی کی روشن مثالیں قائم کی تھیں۔ چارلس بیل اپنی کتاب "بغاوت ہند" (انڈین میوٹنی) میں لکھتے ہیں:

"ہندوستانی جوق در جوق پھانسی پر چڑھتے چلے گئے۔ شہید ہونے والے باغیوں نے جس صبر و استقلال اور طرز عمل کا مظاہرہ کیا اور ایک اصول کی خاطر جس طرح کی سرفروشی کا انداز اختیار کیا وہ واقعی قابل تعریف و لائق ستائش ہے"۔

9
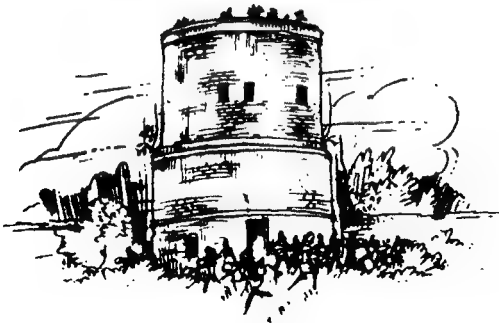
باگھا جتن کی بہادری

یہ اپریل 1906 کی ایک صبح کی بات ہے۔ بنگال کے ضلع نادیا میں ایک تیز رو دریا — گوڑوئی — کے کنارے واقع ایک گاؤں — 'کویار' — کی خاموشی کو ایک چیخ نے منتشر کر دیا۔ گاؤں والے اس دلدلی اور جھاڑی دار علاقہ کی طرف دوڑ پڑے جہاں سے شور بلند ہوا تھا۔ اور وہاں پہنچ کر حیران و ششدر رہ گئے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا — یہ ایک زبردست اور خوفناک نظارہ تھا۔ ایک نہتا نوجوان صرف ایک چھوٹے سے چاقو کے ساتھ ایک نو فٹ لمبے شیر کا مقابلہ کر رہا تھا۔

یہ جنگ تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی۔ کبھی وہ نوجوان شیر کے اوپر آجاتا اور کبھی شیر نوجوان پر چڑھ جاتا۔ دھول کے بگولوں کے بیچ اٹھتے ہوئے خون کے فوارے خاموش ندی کے کناروں سے اٹھتی ہوئی سورج کی لالی سے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ یہ کشتی اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی، دونوں نے ایک دوسرے کو دبوچے ہوئے ایک بار زمین پر قلا بازی کھائی لیکن جو اٹھا وہ آدمی تھا جس کے ننگے سینے پر خون ایک مالا کی طرح جم گیا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر فتح کی مسکراہٹ تھی۔

مرے ہوئے شیر اور بے حد زخمی نوجوان کو کلکتہ لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اگر اس شخص کو مرنے سے بچانا ہے تو اس کی داہنی ٹانگ کاٹنی ہوگی۔ مگر اس جوان نے اپنی ٹانگ کٹوانے سے صاف

انکار کر دیا۔ اس نے شیر مار دیا تھا۔ "اسے ابھی صحت مند رہنا ہے، کیونکہ ابھی اسے ایک اور شیر — یعنی انگریزوں کو مارنا باقی تھا"۔

اور کرشمہ ہی ہوا کہ وہ صحت مند ہوتا چلا گیا۔ اس کے معالج سرجن، سرلیش سرب ادھیکاری، نے اس واقعہ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ان کا یقین تھا کہ یہ نوجوان اپنی قوت ارادی کے باعث ہی اتنے مہلک زخموں کے باوجود زندہ بچ گیا تھا۔ اس طرح یہ نوجوان اپنی اٹھتی جوانی یعنی چھبیس چھبیس سال کی عمر میں باگھ (شیر)۔ گویا شیر مار یا شیر کی طرح بہادر — کہلایا جانے لگا۔

جتن 5/ دسمبر 1879 کو اپنے ماموں کے گھر پیدا ہوا اس بچہ کی پرورش اس کی بیوہ بہن ونود بالا کی شفقت میں ہوئی کیونکہ جب وہ پانچ سال کا ہی تھا تو اس کے والد اور کچھ سال کے بعد اس کی ماں کی موت ہو گئی تھی۔

اس کی جمناسٹک، گھوڑسواری، تیراکی، لاٹھی اور تلوار بازی کی ٹریننگ نوعمری میں ہی ہوئی تھی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اس وقت کے گورا بازار میں جتن نے دیکھا کہ ایک انگریز خوش ہو ہو کر اپنا کوڑا گھمار ہا ہے۔ اسے اس کی بالکل پرواہ نہیں کہ اس کا کوڑا کس پر پڑ رہا ہے۔ کوڑا لگنے والا چاہے پروفیسر ہو یا لوفر، عورت ہو یا بچہ بس وہ تو پیٹتا جاتا تھا اور زور زور سے گنتی گنتا جاتا تھا۔ "یہ لو...... پینتالیس، یہ لو چھیالیس......"

جتن نے ایک منٹ تک تو اس کی یہ حرکت دیکھی۔ پھر اس اندھا دھند اور خوشی خوشی کوڑے برساتے ہوئے شخص کے ہاتھ سے جھٹکا مار کر اس کا کوڑا چھین لیا اور اس انگریز کو نیچے گرا دیا۔ اور پھر اسی کا کوڑا اسی پر برسنے لگا۔

"...... یہ لے انچاس...... یہ لے پچاس......" جتن چلاّتا رہا اور کوڑے برساتا رہا۔

یہ واقعہ اور اسی قسم کے کچھ واقعات تب ہوئے جب جتن ایک طالب علم ہی تھا۔ بعد میں جب وہ بنگال کے گورنر جنرل کے سیکریٹری کا اسٹینو گرافر مقرر ہو گیا تب بھی اسی قسم کے واقعات اس سے وابستہ ہوتے رہے۔ وہ اس وقت بھی کسی ایرا غیرا نتھو خیرا قسم کے سفید فام کے سامنے نوکری پیشہ

ذہنیت دکھانے کو تیار نہیں تھا۔ بلکہ اسے جب بھی موقعہ ملتا وہ ان سفید چمڑی والوں کی بے عزتی کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔

جتن کے ذہن پر جس واقعہ کا سب سے معنر اثر تھا وہ اس کی پیدائش سے دس برس پہلے ہوا تھا۔ اس کو "خونی پل کی داستان" کہا جاتا ہے یہ پل جو 'کویار' سے ہو کر بہنے والی پدما ندی کی بیٹی کہی جانے والی گوروئی ندی پر واقع تھا۔ اس پل کی تعمیر کے سلسلہ میں اس علاقہ کے سینکڑوں ہندوستانی لوگوں کو مزدوری پر لگایا گیا تھا۔ یہ سب ہی لوگ بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ مگر دریا میں طغیانی کی وجہ سے انھیں بار بار پیچھے ہٹنا پڑ رہا تھا۔ اس سے کام کی رفتار اطمینان بخش نہیں تھی۔

اس پر افسروں نے ان کو دھمکایا، "اگر اس بار تم پیچھے ہٹے تو مار دیئے جاؤ گے" لیکن اس کے باوجود بھی لہر آنے پر وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے اور تب ہی ان پر گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ دس یا بارہ آدمی وہیں موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ جتن نے یہ واقعہ اپنے بچپن میں سنا تھا۔

وہ اپنے ان بے زبان ہم وطنوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ اپنے حیران و پریشان ہم وطنوں کی آنکھوں کے سامنے وہ ان صاحبوں کا غرور خاک میں ملانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کے تمام ساتھی زور دے کر یہ بات کہتے کہ اسے ان انگریزوں سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی۔

وہ اپنا کام ایک روشن بے فکری کے ساتھ انجام دیتا اور اس کی اندرونی صلاحیت صاف نظر آتی تھی۔ ایسا ایک انقلابی، ڈاکٹر جادو گوپال مکھرجی کا خیال تھا۔ اس کی صحبت میں رہ کر بزدل بھی سورما بن جاتا تھا۔

1905 میں پرنس آف ویلز کلکتہ سے ہو کر گزرنے والے تھے۔ ہزاروں مردوں اور عورتوں کا ہجوم فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ ایک کونے میں ایک بگھی بھی کھڑی تھی جس میں چند خواتین بیٹھی تھیں۔ اچانک ہوا یہ کہ پرنس کے جلوس کا بہتر طور پر نظارہ کرنے اور کچھ ان خواتین کو تنگ کر کے لطف اندوز ہونے کی غرض سے چھ انگریز نوجوان اس کوچ کی چھت پر چڑھ گئے اور وہیں براجمان ہو کر سیٹیاں بجانے لگے۔ اور خواتین کے چہرے کے سامنے اپنے بوٹ نچانے کی بیہودہ حرکتیں کرنے
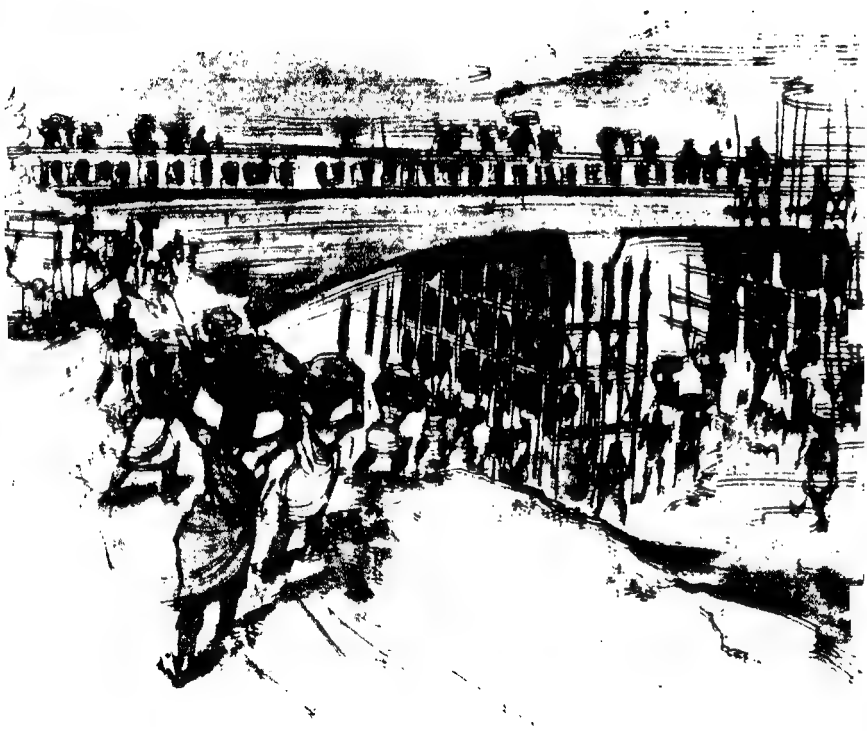
لگے۔ حالانکہ ان خواتین کے ہمراہ ان کے خادم بھی تھے مگر وہ بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔
آگ کی لپٹ کی تیزی سے جتن بگھی کی چھت پر چڑھ گیا اور اس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا وہ چھیل چھبیلے جوان زمین پر پڑے نظر آئے۔ ان سب نے جتن کو پیٹنے کی ناکام کوشش کی اور پھر دوسری مرتبہ منہ کی کھانے اور اپنی ہنسی اڑوانے کے بعد وہ وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ اور بھیڑ میں کھو گئے۔

اس کے دو برس بعد جتن رانا گھاٹ جا رہا تھا۔ ان دنوں تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ صرف لوہے کی موٹی سلاخیں لگا کر ایک دوسرے سے علیحدہ کئے جاتے تھے۔ جتن سے اگلے ڈبہ میں ایک بزرگ اپنی بیٹی کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ دو گورے اسی کمپارٹمنٹ میں چڑھ آئے او حالانکہ آدھے سے بھی زیادہ ڈبہ خالی پڑا تھا مگر وہ دونوں لڑکی کے ادھر ادھر بیٹھ کر اسے اپنے درمیان کھینچنے لگے۔ بزرگ شخص نے ان سے شرافت کی بھیک مانگی۔ لیکن بیکار رہی، بزرگ نے دوسرے مسافروں سے مدد کرنے کو کہا، لیکن سب خاموش بیٹھے رہے۔ گویا کہ انھوں نے یہ مان لیا تھا، حکمراں قوم کو بدتمیزی کرنے کا حق ہے۔
جتن نے اپنے کمپارٹمنٹ سے ایک دہاڑ ماری۔ اسے سن کر یہ دونوں بدمعاش کچھ بےچین سے تو ضرور ہوئے مگر اس سے زیادہ اور ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔
اب یہ شیر اٹھا اور ڈبے کے درمیان کی لگی لوہے کی سلاخیں کھینچ کر دوسرے ڈبہ میں پہنچ گیا۔ اور پھر ان دونوں بدمعاشوں کو اپنے مکوں کا مزہ چکھانے لگا۔ یہ دونوں فرش پر لڑھک پڑے۔ اس نے انھیں اس وقت تک اپنے قدموں تلے دبائے رکھا جب تک کہ انھوں نے اس لڑکی اور اس کے باپ سے معافی نہ مانگ لی۔

اس سلسلہ کا آخری واقعہ تب رونما ہوا جب جتن ایک بار دارجلنگ جا رہا تھا۔ اسی ٹرین سے ایک برطانوی رجمنٹ بھی سفر کر رہی تھی۔ جس کے سربراہ چار افسر ٹرین رکنے پر ہر بار پلیٹ فارم پر اتر کر نواب زادوں کی طرح مٹر گشت کرتے تھے۔
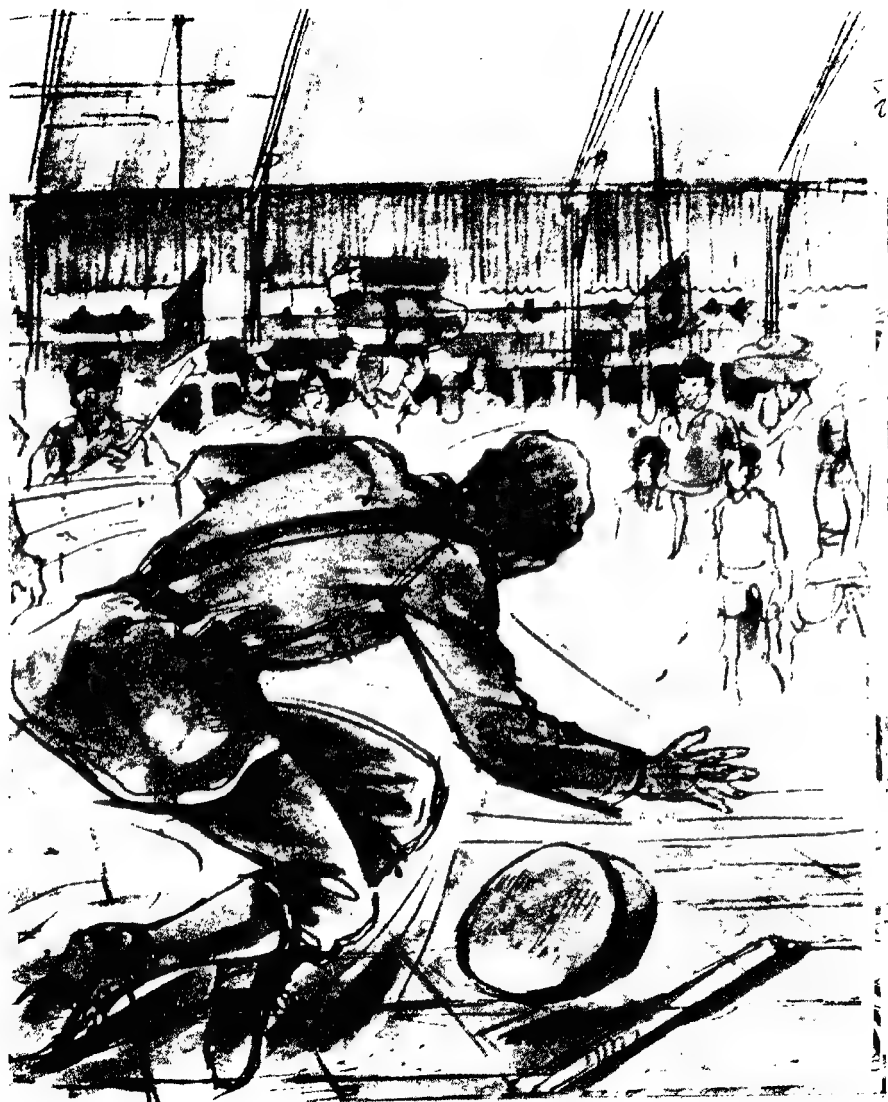
ایک پلیٹ فارم پر جتن ایک اجنبی بیمار مسافر کے لیے ایک مگ پانی لانے کے لیے اترا۔ جب وہ دوڑ کر واپس آ رہا تھا تو تھوڑا سا پانی ایک افسر کی پتلون پر گر گیا۔ وہ افسر فوراً مڑا اور اپنی چھڑی جتن کی کمر پر دے ماری۔ جتن نے اپنے کندھے پر سے اچٹتی ہوئی نگاہ سے اسے دیکھا مگر رکا نہیں کیونکہ بیمار آدمی پانی کے لیے چلا رہا تھا۔ مگر وہ فوراً ہی پلیٹ فارم پر واپس آ گیا اور اس آفیسر کی کلائی اپنی فولادی گرفت میں پکڑ لی۔ چھڑی اس آفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ تکلیف سے چلانے لگا۔ اس کے ہم وطنوں نے جتن پر حملہ کر دیا۔ مگر ہر ایک کو منہ کی کھانی پڑی۔

ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جتن کو پولیس نے پکڑ لیا۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ ایک ضروری سرکاری کام سے دارجلنگ جا رہا ہے اور اسے بلاوجہ روک کر اس اہم سرکاری کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اس کے خلاف تاہم دھاوا بولنے کا ایک مقدمہ درج ہو گیا۔

اس مقدمہ کے شروع میں ہی انگریز جج نے ان آفیسروں سے جن کے ساتھ جتن کا جھگڑا ہوا تھا پوچھا: اچھا آپ چاروں کی اس شخص نے پٹائی کر دی؟ "جی حضور" وہ فوراً ہی بول پڑے۔ جج کچھ دیر تو خاموشی سے انھیں دیکھتا رہا اور پھر بولا "تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم چاروں ہٹے کٹے برطانوی فوجی آفیسران اس دیسی کے آگے صفر ثابت ہوئے؟" "جی یہ صحیح ہے......" وہ ہکلائے۔ اب انگریز جج نے ناراضگی کے ساتھ یہ بات سمجھائی "وقت بہت خراب آ گیا ہے۔ کیا تمھیں اس کا احساس ہے کہ اگر یہ مقدمہ چلا تو ہمارے آدمیوں کے لیے انتہائی شرم کا باعث ہوگا۔ اور اس سے نام نہاد قوم پرستوں کے حوصلے بلند ہوں گے۔ چنانچہ مقدمہ واپس لے لیا جائے۔"

اس انقلابی دور کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ ایسے بے شمار قصے بے مثال بہادری اور شاندار قربانی سے بھرے ہوئے سناتے تھے جن سے باگھا جتن کا نام وابستہ تھا۔ اس کے کردار کی عظمت کو سلام کرنے کے لیے ہمیں اس کی خوبصورت فکر کو سمجھنا ہوگا جو اس کی شخصیت کی محرک تھی، لڑکپن میں ہی وہ سسٹر نویدیتا کے ساتھ جڑ گئے اور کلکتہ میں پھیلی مہاماری کے دوران سسٹر نویدیتا کے ذریعہ چلائے گئے ریلیف کے کام میں سخت محنت کی۔ سسٹر نویدیتا نے اس ہونہار نوجوان کو

سوامی وویکانندجی سے ملوایا، بعد میں ہندوستانی قومیت کے پیغامبر اروند گھوش سے اس کی براہ راست ملاقات ہوئی۔ یہی سری اروند تھے جنھوں نے ہندوستانی زندگی کے بحر میں اٹھنے والی قوم پرستی کی نرم رو لہروں کو تند و تیز انقلابی امواج میں تبدیل کر دیا اور نوجوانوں کو یہ پیغام دیا کہ ہندوستان زمین کا کوئی معمولی سا ٹکڑا نہیں ہے بلکہ یہ تو ہماری زندہ ماں ہے۔

بنگال کے اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کرزن نے فیصلہ کیا کہ بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس سے ان کا مقصد بنگالی اتحاد کے ٹکڑے کرنا تھا، جو دن بہ دن برطانوی مخالف روپ اختیار کرتا جارہا تھا۔ اگر یہ حکومت اپنے منصوبہ میں کامیاب ہوتی اور بنگال تقسیم ہو جاتا تو آگے چل کر اسی پالیسی کا نفاذ گورنمنٹ ان سب صوبوں میں کرتی جہاں قوم پرستی کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی تھیں۔

مگر اس مجوزہ تقسیم کے خلاف بنگال کے رہنے والوں میں زبردست ناراضگی پھیل گئی۔

اس وقت تک برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے تصور نے بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا اور وہ آزادی حاصل کرنے کے لیے ''کرو یا مرو'' کا عہد کر چکے تھے۔ اس قسم کے انقلابی نوجوانوں کی کئی جماعتیں وجود میں آچکی تھیں۔ جتن ان کے لیڈر بن گئے تھے۔

ان کی کارروائیوں نے غیر ملکی حکمرانوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ حکومت نے ان کے لیڈر کا پتہ لگانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بہت گہرائی سے تفتیش کرنے پر انھیں معلوم ہوا کہ ان کا لیڈر جتن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔

جیل میں جتن کو پندرہ مہینے تک مختلف قسم کی ایذائیں دی جاتی رہیں۔ ان تمام تکلیفوں کو وہ صبر و سکون سے برداشت کرتا رہا۔ یہ اسے گرفتار کرنے والوں کے لیے ایک سخت آزمائش تھی۔ اپنے خاموش، پر سکون اور صابر قیدی کی شخصیت کے سامنے وہ لوگ اپنے آپ کو پست اور بہت چھوٹا محسوس کرتے تھے۔

آخر میں انھوں نے اپنی حکمت عملی یکسر تبدیل کر دی۔ چند دنوں کے پر تپاک برتاؤ کے بعد

ایک دن ایک شیریں بیان افسر نے اس کے سامنے "مال و دولت، خوبصورت بنگلہ، بہترین شراب اور حسین عورتوں" کے تحفے پیش کرنے کی تجویز رکھی۔

"چپ رہو!" جتن نے چیخ کر کہا، افسر کے سر کے بجائے میز پر اتنی زور سے مکا مارا کہ وہ چٹاخ سے ٹوٹ گئی اور خوش بختی سے وہ افسر بچ گیا۔

II

استغاثہ میں جتن کے خلاف کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکی اس لیے مقدمہ خارج ہو گیا اور 1911 میں اسے آزاد کر دیا گیا۔ اس بات سے برطانوی حکمراں جھنجھلا اٹھے۔

اسے سرکاری ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ انقلابی کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے جتن نے ایک تجارتی کمپنی قائم کر لی۔ اور بہت سے تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے۔ بظاہر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ جتن ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اپنی تجارت کے سلسلہ میں دوڑتا پھرتا۔ پولیس نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ چلو باگھا کی مصیبت سے تو نجات ملی اور یہ کہ بیوی اور دو عدد بچوں کی کفالت کے چکر میں خاصا دنیادار بن گیا تھا۔ مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

وہ جگہ جگہ جا کر انقلابیوں سے رابطہ قائم کر رہا تھا۔ اور ان کی جسمانی اور ذہنی تربیت کا انتظام کر رہا تھا وہ ان کو گیتا کے مطالعہ کی ترغیب دیتا تھا۔ جس سے اس کے جیسا کرم یوگی خود تمام تر قوت حاصل کرتا تھا۔

آزادی کی جدو جہد کے سلسلہ میں اس کے مد نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستانی عوام کے دلوں میں مادر وطن کی اتنی شدید محبت پیدا کر دی جائے کہ پھر انھیں غیر ملکی حکمرانوں کے لادے ہوئے جوئے کا بوجھ اپنے کاندھوں پر برداشت کرنا ناممکن ہو جائے۔ اس عام بیداری کے ساتھ ہمدرد فوج کی مدد سے جب انقلاب برپا ہوگا تو ضرور کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انقلاب کے حصول کے لیے برطانیہ مخالف اور ہندوستان سے ہمدردی

رکھنے والی طاقتوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔

جتن نے 1906 میں ہی غیر ملکی حکومتوں اور غیر ملکوں میں بسے ہوئے ہندوستانیوں سے رابطہ قائم کرنے کی ابتدا کر دی تھی۔

اس قسم کے رابطے مسلسل قائم کرتے رہنے کی راہ میں سب سے بڑی دشواری پیسہ کی کمی تھی۔ جس کو کسی حد تک دور کرنے میں اندو بھوشن مترا نے مدد کی جو ایک جاگیری ریاست میں کارندہ یا منشی تھا۔

اسی شخص نے ریاست کے ایک لاکھ گیارہ ہزار روپے کے لگان کی آمدنی لاکر جتن کے ہاتھ پر رکھ دی اور فرار ہو گیا۔ وہ جلد ہی گرفتار کر لیا گیا اور پھر جیل پہنچا کر اسے ایذائیں دی جانے لگیں مگر اس شخص نے کبھی بھی اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھایا کہ وہ پیسہ گیا کہاں تھا۔

اس انقلابی جماعت کے ایک نوجوان نمائندہ سین کو جلد ہی جرمنی بھیجا گیا۔ سین سے موصول شدہ، پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے قریب جس سے انگریزوں کے سر پر مسلط بحران کا پتہ چلتا تھا، اطلاعات سے انقلابیوں کو اپنا لائحہ عمل ترتیب دینے میں کافی مدد ملی۔

1911 میں جتن کلکتہ میں موجود جرمنی کے قونصل جنرل سے ملا۔ اس نے اپنی جدوجہد میں جرمنی سے امداد حاصل کرنے کی غرض سے اس کے ساتھ کئی بار ملاقات کی۔ قونصل جنرل نے اپنی حکومت کی ہدایات کے پیش نظر جتن کی ہمت افزائی کی۔ فوراً ہی امریکہ، ہونولولو، بٹادیا، منیلا وغیرہ میں موجود جرمنی مشنوں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ ہندوستانی انقلابیوں کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کریں۔

اسی دوران میں لالہ ہردیال نے سین فرانسسکو سے ایک میگزین ''غدر'' کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔ یہ رسالہ غدر پارٹی کا نقیب تھا۔ تارک داس کو جتن نے امریکہ بھیجا تھا وہاں انھوں نے ہردیال سے اشتراک کیا۔ مسٹر برکت اللہ نے جو ٹوکیو میں پروفیسر تھے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور غدر تحریک کے لیے پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ایک بزرگ انقلابی کے۔ سی۔ گھوش ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

”ہندوستان کا وہ قابل فخر اور عظیم دن تھا جب ملک سے باہر بسے ہوئے یہ ہندوستانی مجاہدین ہر قسم کے بھید بھاؤ سے پاک تھے۔ ذات پات، علاقائی یا پارٹی کی کوئی تفریق ان میں نہ تھی۔ ہر شخص اپنے ذاتی مفادات اور پہچان کو ختم کر کے عوامی تحریک میں ڈوب گیا تھا۔ اور صرف ایک قومیت کے اعلیٰ ترین مقصد اور قومی جذبہ سے سرشار ہو کر قومی خدمت انجام دیتا تھا۔“

آزادی کی تحریک میں مدد دینے والی غیر ملکوں میں منظم کی گئی بہت سی تنظیموں کی اطلاعات انقلابیوں کو برابر مل رہی تھیں۔ انھوں نے کلکتہ میں ہیری اینڈ کمپنی نام کی ایک دوکان کھول لی۔ جو بظاہر تو سامان درآمد۔ برآمد کیا کرتی تھی مگر اس کے ذریعہ خفیہ طور سے غیر ملکوں سے رقومات، پیغامات اور ہتھیار حاصل کیے جاتے تھے۔

جتن کے ساتھی ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ ایک زبردست انقلاب کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ حالانکہ یہ منصوبہ نہایت خفیہ انداز میں بنایا گیا تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس کی بھنک پولیس کو مل گئی۔ انھوں نے اس بات کے کافی ثبوت حاصل کر لیے کہ اس انقلاب لانے کے منصوبہ کی پشت پر جتن کا دماغ کام کر رہا ہے۔ پولیس نے اسے ایک مرتبہ پھر سے گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر جتن کہیں ہاتھ نہیں آیا۔

پولیس میں بے چینی کی زبردست لہر پھیل گئی۔ اشتہارات اور مراسلوں کے ذریعہ بار بار اس بات کا اعلان کیا جا رہا تھا کہ جتن کو گرفتار کرانے میں تعاون دینے والے کو بہترین انعام سے نوازا جائے گا۔ اس کے پیرو اپنے لیڈر سے مسلسل یہ درخواست کر رہے تھے کہ وہ بہت زیادہ ہوشیار اور محتاط رہے۔ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ جتن کو کلکتہ چھوڑ دینا چاہئے۔ اور یہ جتنی جلدی ہو اتنا ہی بہتر ہوگا۔

بالآخر جتن نے کلکتہ چھوڑ دیا لیکن اپنی ذاتی حفاظت کے لیے نہیں۔ کچھ غیر ملکی جہاز اسلحہ اور بارود وغیرہ لے کر جلد ہی ہندوستان پہنچنے والے تھے۔ اس ”سامان“ کو اتروانے کے لیے اڑیسہ کے بالاسور ساحل پر ایک بہترین مقام کا انتخاب بھی کر لیا گیا تھا۔ جہاں ان جہازوں کو خفیہ طور پر

دریائے "بدھ بالنا" کے دہانے تک لاکر ان پر سے اسلحہ اور بارود وغیرہ حفاظت سے اتارا جا سکتا تھا اور قریبی جنگل اور پہاڑی علاقہ میں محفوظ طریقہ سے چھپایا جا سکتا تھا۔

III

جتن کاپٹی پاڈا کے قریب مقام گوپال ڈیہا آ گیا۔ ایک چھوٹی سی جاگیری ریاست کا یہ صدر مقام تھا جو اڑیسہ میں بالا سور تھ سے 5 کلو میٹر مغرب میں واقع تھا۔

1915 میں یہ ایک چھوٹا سا خاموش بازار ہوا کرتا تھا۔ جتن اپنے دونوں جوان ساتھیوں کے ساتھ یہیں مقیم ہو گیا۔ ایک کا نام تھا چتا پریو اور دوسرے کا منورنجن تھا اس کے دو اور ساتھی نیرین اور جیوتش ان سے دس کلو میٹر دور ٹھہر گئے۔ ان لوگوں کے ایک مقامی ہمدرد — منندر چکرورتی نے اس علاقہ میں تھوڑا سا جنگل پٹے پر لے رکھا تھا۔ اب اس نے اس گروہ کے لیے ایک دکان بھی کھول دی تھی تاکہ یہ لوگ اپنی کارروائیاں جاری رکھ سکیں اور کسی کو پتہ بھی نہ ہو۔ کلکتہ کی یونیورسل ایمپوریم کے نام سے بائیسکل ایجنسی کی شکل میں چلائی جا رہی ایک فرم کے ذریعہ انقلابی لوگ ایک دوسرے سے برابر رابطہ قائم رکھتے تھے۔ جتن اور اس کے ساتھیوں نے اپنے نام بدل لیے تھے۔ اس علاقہ کے رہنے والے اس جماعت کے لیڈر کو "سادھو بابا" کے نام سے جانتے تھے۔ ضرورت مند کی مدد کرنے اور عوامی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہنے کی نمایاں خصوصیات سے اس بابا کو سب بہت چاہنے لگے تھے۔

جرمن جہاز مارِوک نے اپریل میں سان فرانسسکو کی بندرگاہ چھوڑی۔ یہ جہاز ہتھیار اور گولے بارود سے لدا ہوا تھا۔

مگر قسمت اس مہم کے خلاف تھی اس کا پتہ کسی طرح برطانوی جاسوسوں کو لگ گیا اور کچھ برطانوی جہاز اس کا پیچھا کرنے لگے۔ جب اس کے کیپٹن نے یہ دیکھا کہ وہ مقابلہ کیے بغیر ان جہازوں سے نہیں بچ سکتا تو اس نے وہ سارا گولہ بارود، اسلحہ اور ساری دستاویزات سمندر یعنی بحر الکاہل میں پھینک دیئے۔ آخر اس جہاز کو انڈونیشیا کی بندرگاہ پر پکڑ لیا گیا۔

یہ خبر جتن کو بھی پہنچ ہی گئی۔ کسی بھی قسم کی ناامیدی اور مایوسی کا اظہار کیے بغیر وہ کہہ اٹھا: ''یہ تو اس سب سے بڑی طاقت یعنی خدا کی طرف سے اس بات کی جانب ایک اشارہ ہے کہ ہمیں ملک کی آزادی بیرونی مدد کے بغیر اپنے ہی بل بوتے پر حاصل کرنی ہوگی۔''

اس کے معنی یہ ہرگز نہیں تھے کہ اس نے غیر ملکوں سے رشتے توڑ لیے۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو پھر 'بٹاویا' بھیجا اور جرمن حکومت کو اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ ہتھیاروں اور گولہ بارود سے بھرے ہوئے دو اور جہاز ہندوستان کے لیے روانہ کرے۔ اسی دوران میں جتن کو تلاش کرنے کی کوششیں اور تیز کر دی گئیں:

ایک معمول کی تفتیش کے دوران پولیس کو کلکتہ کی پیری اینڈ کمپنی (انھیں اس کے کاروبار کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا) اور بالاسور کے یونیورسل امپوریم کے بیچ تعلق کی بھنک مل گئی۔

4 / ستمبر 1915 کو گورنمنٹ آف انڈیا کے خفیہ محکمہ کے ڈی۔ آئی۔ جی، جی۔ ڈی، ڈینہم (G.D. Denham)، ڈپٹی کمشنر آف پولیس چارلس ٹیگارٹ (جنھیں بعد میں ''سر'' کا خطاب ملا) اور سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ایل۔ این۔ برڈ بالاسور پہنچے۔ انھوں نے یونیورسل امپوریم کی پوری طرح سے خانہ تلاشی لی۔ انھیں کوئی بھی اہم چیز ہاتھ نہ لگی اور وہ وہاں سے شکستہ دل روانہ ہونے والے ہی تھے کہ ان کی نگاہ ایک ایسے کاغذ کے مڑے تڑے پرزے پر پڑی جس پر شکستہ لفظوں میں ''کاپٹی پاڈا'' لکھا ہوا تھا۔ اس وقت کاپٹی پاڈا کوئی ایسا علاقہ نہیں تھا کہ جو امپوریم جیسی کسی تجارت سے وابستہ ہو سکتا ہو۔ ان لوگوں نے اس معمولی سی نشاندہی پر آگے تفتیش جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

انھوں نے بالاسور، نیل گری اور میور بھنج کے پولیس عملہ کو چوکنا کر دیا اور کاپٹی پاڈا کی طرف چل دیے۔ جتن نے خود اپنی آنکھوں سے 6 / ستمبر کو ان لوگوں کو آتے دیکھا۔ اس وقت بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اسے ان کے آنے کا مقصد جان لینے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔

جتن کی کاٹیج الگ تھلگ ایک جنگل نما علاقہ میں واقع تھی۔ اگلے دن ان افسران نے علاقائی ایس۔ ڈی۔ او اور اس کے سپاہیوں کے ہمراہ اس کاٹیج کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند

تھا۔ اب اسے کھولے کون؟ اس میں بہر حال کچھ نہ کچھ خطرہ تو تھا۔ اسی لیے گورے صاحبوں نے ایک ہندوستانی افسر کو یہ کام سونپ دیا۔

اس نے یہ دروازہ توڑ ڈالا۔ اندر چند کتابوں، دوائیوں کے بکس اور کچھ بارود کے علاوہ کچھ بھی نہ ملا۔ اس کاٹیج کے پچھلے حصہ میں انھیں ایک نشانہ بازی کا ہدف ایسا ملا کہ جس پر بہت زیادہ چاند ماری کی گئی تھی۔

یہاں سے مایوس ہو کر یہ لوگ مندر چکرورتی کے مکان پر پہنچے اور اس پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ بابو لوگ شکار کے لیے گئے ہیں۔

اب پولیس کمشنر نے کانسٹیبلوں اور چوکیداروں کو آس پاس کے تمام علاقہ میں دوڑا دیا تاکہ وہ گاؤں والوں کو بتا سکیں کہ بہت خطرناک قسم کے ڈاکوؤں کا ایک گروہ ان کے قبضہ سے نکل کر اس علاقہ میں آگھسا ہے۔ ان کے متعلق اطلاع دینے والے یا انہیں پکڑوانے والے کسی بھی شخص کو دس ہزار روپیوں کا انعام دینے کا اعلان بھی کیا گیا۔

خبر پھیلتے پھیلتے یہ دس ہزار کی رقم جلد ہی بڑھا کر ''دس لاکھ'' کر دی گئی۔ کاپٹی پاڈا کے جنگل کے چپہ چپہ کو چھان مارا گیا مگر بے سود۔

ڈینہم ایک مسلح پولیس دستہ کے ہمراہ کاپٹی پاڈا میں نگرانی کرتا رہا۔ جبکہ دوسرے لوگ بالا سور واپس پہنچ گئے تاکہ زیادہ کمک لے کر اور زیادہ سرگرمی سے تلاش کر سکیں۔

مسلسل بارش کے دوران جتن کی کاٹیج اور چکرورتی کے مکان کی نگرانی کی جا رہی تھی اس کے باوجود آدھی رات کے وقت ایک بار جتن چکرورتی سے ملاقات کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے آیا اور پھر خدا حافظ کہہ کر چپ چاپ چلا گیا۔

یہ لوگ رات بھر چلتے رہے۔ 8 ستمبر کی صبح کو پولیس کا جال کاپٹی پاڈا سے لے کر بالا سور تک کے پورے علاقہ میں پھیل چکا تھا۔

چتاپریو اور منورنجن اپنے پیارے لیڈر سے رو رو کر بار بار درخواست کر رہے تھے کہ وہ انھیں ان

کے حال پر چھوڑ کر خود کسی محفوظ جگہ نکل جائے۔ انھیں اس میں قطعاً بھی شبہ نہیں تھا کہ جتن بڑی آسانی سے اپنی تنہا جان بچا کر نکل سکتا ہے۔ وہ کہتے ”دادا، اگر تم زندہ رہے تو ہر چیز دوبارہ منظم ہو سکتی ہے“۔

مگر جتن ان کی درخواست پر بڑے بھائی کی طرح شفقت سے مسکرا کر رہ جاتا۔ وہ اگلے کیمپ سے دیگر دو ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔

یہ پانچوں بہادر پھر آگے بڑھتے چلے گئے۔

بعد میں ان کا تعاقب کرنے والوں نے یہ تسلیم کیا کہ جتن اور اس کے ساتھیوں نے کئی مرتبہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی اور پولیس کی پکڑ سے صاف بچ کر نکل گئے تھے۔ وہ اس موت کے پھندے سے بھی بچ کر نکل گئے ہوتے۔ اگر دیہات کے رہنے والوں میں پولیس نے ان لوگوں کے ڈاکو ہونے کی بدگمانی نہ پھیلادی ہوتی۔

بالاسور میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس جماعت کو پناہ دینے یا اس کو بچ کر نکل جانے میں مدد دینے کے لیے ہر قسم کا خطرہ اٹھانے کو تیار تھے۔ لیکن وہ ان روپوش لوگوں کی اصلیت سے ناواقف تھے۔ جلد ہی ایک بھیڑ اکٹھی ہوگئی ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔ اسی دوران ان لوگوں کی مشتبہ نوعیت کی اطلاع پولیس اسٹیشن تک پہنچ گئی۔

ایک پولیس انسپکٹر بھی آگیا تھا اور اس نے جتن کی کلائی پکڑلی تھی۔ مگر جتن نے اسے واقعی طور پر بھیڑ پر اچھال دیا۔

اب اس جماعت کی راہ میں پھر سے دریا حائل ہوگیا تھا اور اسے پار کرنے کے لیے کوئی کشتی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے ہتھیار اور گولے بارود کے تھیلوں کو پانی سے اوپر رکھتے ہوئے جوں توں کر کے دریا پار کیا۔

ایک چھوٹے سے گاؤں جسا کھنڈ سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ اس کے سامنے ایک تالاب اور اس تالاب کے کنارے گھنی جھاڑیاں اور دیمک (Ant-hills) کے گھر تھے۔ ان لوگوں نے مقابلہ

کرنے کے لیے اسی جگہ رک کر انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔
ایک مرتبہ پھر جتن کے ساتھیوں نے انھیں چھوڑ کر تنہا نکل بھاگنے کی درخواست کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پولیس سے بھڑ جائیں گے اور اس طرح پولیس کو اپنے ساتھ الجھائے رکھیں گے تاکہ جتن کو اس عرصہ میں طویل فاصلہ طے کرنے کا موقع مل جائے لیکن جتن نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔

جماعت کے بچ کر نکل جانے کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً ہی ضلع کلکٹر، کِلبی کو اطلاع کرنے دوڑ پڑا۔ کلبی ابھی ابھی کاپٹی پاڈا سے واپس لوٹا تھا۔ اب یہ دونوں فوج کے ایک اور شعبہ یعنی پردف ڈپارٹمنٹ کے سارجنٹ رڈرفورڈ کے پاس پہنچے۔ مسلح پولیس اور ملٹری کے تین جتھے جیسا کھنڈ کی جانب بڑھے۔
دوپہر ڈھلنے کے قریب تھی کہ یہ لوگ گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ پولیس کے ایک مخبر نے اس ٹیلے کی جانب اشارہ کیا جہاں یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ کِلبی کی پارٹی پہلے آگے بڑھی۔ لوگوں کی ایک بھیڑ کافی دور سے اس واقعہ کو دیکھ رہی تھی۔ کِلبی نے بعد میں جج ٹی۔ سی۔ میکفرسن کو بیان دیتے وقت بتایا کہ پہلے اس نے احتیاطاً ایک فائر باغیوں کو وارننگ دینے کے لیے کیا۔ کِلبی نے دراصل یہ سمجھا تھا کہ یہ تھکے ماندے نیند کے مارے بھوکے پیاسے لوگ بغیر کسی مدافعت کے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں گے باغی صرف پانچ تھے۔ اگر وہ پچاس بھی ہوتے تو بھی انھیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ ایک غیر مساوی جنگ ہو گی۔
کِلبی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیونکہ باغی کسی طرح بھی ہتھیار ڈالنے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ جیسے ہی رڈرفورڈ اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچا تو کِلبی نے اس سے مشورہ کیا۔ رڈرفورڈ نے مشورہ دیا کہ وہ فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اور انھوں نے یہی کیا جب پہلے کئی گولیوں کا کوئی جواب نہ دیا گیا تو وہ کچھ تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپ کر اور رینگ کر آگے بڑھے۔

کلِھی اور رڈر فورڈ کو یہ خیال تھا کہ جتن اور اس کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ کے نام پر صرف ریوالور ہی موجود ہوں گے — کیونکہ ان کے مطابق وہ بندوقوں اور گولے بارود کے ساتھ دریا پار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اس قیاس کو اس وقت اور بھی تقویت ملی کہ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ انھیں گولی کا جواب گولی سے تو مل ہی نہیں رہا تھا۔

اب سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ٹیلے پر چڑھ جائیں۔

اس ٹیلے پر دیمک کے گھروں کے پیچھے جتن اور اس کا جتھا گھات لگائے بیٹھا تھا، اتنا ہی خاموش جتنے چپ چاپ یہ ٹیلے تھے۔

کلِھی اور رڈر فورڈ کو ان لوگوں کی حکمت عملی سمجھنے میں بہت دیر لگی۔ جیسے ہی سپاہی ان کی بندوقوں کے نشانوں کی حد میں آئے انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ سب سے آگے جو سپاہی چل رہے تھے الٹ کر گرے اور نیچے لڑھکتے چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ جتھا گولیوں کی دوسری بوچھار کرتا پیچھے والوں کو تیزی سے آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ مگر جتن نے انھیں قطعاً مہلت نہ دی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان پر ٹیلے سے کڑک کے ساتھ بجلیاں گر رہی ہوں۔ انھیں آگے بڑھنے کا قطعاً موقع نہیں مل رہا تھا۔ اور انھیں ذلت کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا۔

افسران کو کچھ مزاحمت کی امید تو تھی مگر جو ہوا وہ ان کی امیدوں کے بر خلاف تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو حیران کھڑے رہے اور پھر انھوں نے جلدی سے ایک فیصلہ کیا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ ایک بار ان کے ہاتھوں سے نکل گئے تو وہ پھر کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انھوں نے اس کی پرواہ کرنی بند کر دی کہ ان کے کتنے لوگ مارے جائیں گے۔ اب ان کی ساری توقعات صرف اس بات سے وابستہ تھیں کہ باغیوں کا بارود اور گولیاں کتنی جلد ختم ہوتی ہیں۔ اپنے سپاہیوں کو ایک بار پھر آگے بڑھنے اور جتنی تیزی سے بھی ہو فائرنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے کچھ آدمیوں کو رائفل لے کر اونچے درختوں پر بھی چڑھا دیا تاکہ وہ اوپر سے دیکھ کر دیمک کے گھروں کے پیچھے چھپے باغیوں کو نشانہ بنا سکیں۔

یہ مقابلہ تقریباً تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ یہ اور زیادہ بھی چلا ہوتا۔ مگر اپنی پہلی پیٹی کے کارتوس ختم کرنے کے بعد جب باغیوں نے کارتوسوں کی دوسری پیٹی کھولنی چاہی تو اس کی چابی انھیں نہ مل پائی۔ اس پیٹی کا موٹا چمڑا پھاڑ ڈالنا بھی آسان نہ تھا۔ جب وہ اس جدو جہد میں مصروف تھے۔ وہ تمام کے تمام بری طرح زخمی بھی تھے اور ان کے جسم سے جا بجا خون بہہ رہا تھا تو ایک سپاہی نے جو ایک درخت پر چڑھ چکا تھا چتا پریو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جتن کا ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا، سینے کے زخم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ پھر بھی جتن نے چتا پریو کا سر اپنی گود میں رکھا اور فائرنگ جاری رکھی۔ اب ان کے پاس ایک بھی کارتوس نہیں بچے۔ جتن بھی بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ جب افسران کو یہ یقین ہو گیا کہ اب پہاڑی پر واقعی اسی خاموشی چھا چکی ہے تو وہ اوپر چڑھے۔

جتن پیاسا تھا، کلبی فوراً ہی اپنے ہیلمٹ میں پانی لایا اور نہایت ادب سے اس مرتے ہوئے ہیرو کو پیش کیا۔ جتن نے اس کا شکریہ ادا کر کے پانی لے لیا۔

اب شام ہو چکی تھی۔ زخمیوں اور مرے ہوئے لوگوں کو شہر کے اسپتال میں لایا گیا۔ بارش ہو رہی تھی اس لیے کلبی نے جتن کو اپنے کوٹ سے ڈھک دیا۔ جتن تمام راستہ ہوش میں تھا۔

"مسٹر مکھرجی کیا آپ کچھ کہہ رہے ہیں؟" کلبی نے پوچھا

"ہاں" جتن نے کہا۔ "برائے مہربانی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ان لڑکوں کے ساتھ نا انصافی نہ ہو۔ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کے لیے میں اکیلا ہی ذمہ دار ہوں" اس نے اپنی درخواست پھر دہرائی۔

جتن کا آپریشن کیا گیا۔ گولیاں ان کے پیٹ میں پیوست تھیں۔ آپریشن کامیاب رہا۔ رات بھر کی نگرانی سے کلبی اور دیگر لوگوں کو کچھ مہلت ملی۔

مگر 10 ستمبر 1915 کو صبح کو پتہ چلا کہ زخموں کے کچھ ٹانکے ڈھیلے ہو گئے ہیں جتن تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی حالت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔

چارلس ٹیگارٹ عجلت میں بالاسور پہنچا اور ہچکچاتے ہوئے جتن سے پوچھا "ٹھکرجی، مجھے بتاؤ میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

جتن مسکرایا اور کہا "کچھ بھی نہیں، شکریہ اب سب کچھ ختم ہو چکا۔ خدا حافظ"

بعد میں چارلس ٹیگارٹ نے کہا تھا "میری ملاقات ہندوستان کے سب سے بہادر آدمی سے ہوئی...... مگر مجھے اپنا فرض ادا کرنا پڑا"۔

کچھ عرصہ بعد نیرین اور منورنجن کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ ان کے آخری کلمات تھے "(خدا کرے کہ) برطانوی حکومت غارت ہو"۔

جیوتش کو انڈمان (کالے پانی) بھیج دیا گیا۔ بعد میں بہرام پور جیل میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے جو کام آخر وقت میں کیا وہ جیل کی دیواروں پر جتن کی تعریف لکھنا تھا۔

باگھ جتن لافانی ہستی بن گیا تھا کافی برسوں کے بعد بھگت سنگھ نے 9/ستمبر 1923 کو اس شیر کی یاد میں پنجاب میں "شہیدی دوس" منایا۔ نذرالاسلام نے بالاسور کی لڑائی، کو نئے ہندوستان کی 'ہلدی گھاٹی'، سے تعبیر کیا۔

چیساکھنڈ کی جس سڑک پر پولیس نے جتن کا تعاقب کیا تھا آج اس کا نام "باگھ جتن روڈ" ہے ــــ یہی وہ شاہراہ ہے جو اس ملک کے سب سے مقدس مقام تک جاتی ہے۔